تذکرۂ اقبال



بہ سلسلۂ صد سالہ جشنِ ولادتِ اقبالؒ

تذکرۂ اقبال علیہ الرحمۃ

○

سعید راشد

○

بک کارنر پبلشرز۔ مین بازار۔ جہلم

بہ سلسلۂ صد سالہ جشنِ ولادتِ اقبالؒ

تذکرۂ اقبال علیہ الرحمۃ

تذکرۂ اقبال

اہتمام ———— شاہد حمید
تزئین ———— گگن شاہد
اشاعت ———— جنوری ۱۹۹۶ء
مطبع ———— فرینڈز پرنٹرز جہلم
قیمت ———— دو سو روپے (=/۲۰۰)

انتساب

جنوری ۱۹۳۸ء میں پنڈت جواہر لال نہرو، میاں افتخار الدین کے ساتھ علامہ کی خدمت میں سیاسی تبادلۂ خیالات کے لیے جاوید منزل لاہور میں حاضر ہوئے دورانِ گفتگو دخل در معقولات کے انداز میں میاں افتخار الدین (جو اُس زمانے میں کٹر کانگریسی تھے) بیچ میں بول پڑے

"ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے. مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں. اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس سے مذاکرات کریں تو بہتر نتیجہ نکل سکتا ہے"

علامہ نے یہ سنتے ہی بڑی برہمی سے کہا:

"اچھا تو یہ چال ہے. آپ مجھے ورغلا کر مسٹر جناح کے مقابلہ میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں. میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں. میں تو اُن کا ایک معمولی سپاہی ہوں"

مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کے نام

جنہوں نے پاکستان کے حوالے سے اپنے آپ کو بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کا ایک معمولی سپاہی کہنے میں فخر محسوس کیا۔

محمد سعید راشد

باب اوّل

داستانِ حیات

(آپ بیتی)

"گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان"

خاندانی پس منظر

روشن دماغی اور روشن ضمیری اقبال کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ چنانچہ خود فرمایا:۔

"میرے آباؤ اجداد برہمن تھے انہوں نے عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے۔ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے؟" اشعار میں بھی اپنی برہمن زادگی کا تذکرہ کیا ہے:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا میرے لاتی و مناتی

علامہ اقبال کے اپنے بیان کے مطابق ان کے اجداد کی رہائش موضع چکو پرگنہ اڑون تحصیل کولگام کشمیر میں تھی۔ اور ان کا تعلق برہمنوں کی سپرو گوت سے تھا۔ سپرو کے لفظی معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھے۔" برہمنوں کی اس شاخ نے کشمیر میں سب سے پہلے فارسی لکھنا پڑھنا شروع کی اور اس میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کی۔ اور مغل دربار میں سرخرو ہوتے۔ اس علمی اور سماجی امتیاز کی وجہ سے وہ سپرو کہلائے۔ اس سپرو گوت کے ایک بزرگ نے سری نگر میں سنہ ۱۴۷۵ء کے لگ بھگ ایک صاحب حال و صاحب نظر سید درویش کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور قبول اسلام کے بعد صالح نام پایا۔ یہ صرف نام ہی کے صالح نہ تھے سیرت بھی صالح تھی چنانچہ انہوں نے بہت جلد اپنے مرشد کی تربیت اور توجہ سے روحانیت کی بہت سی منزلیں طے کر لیں اور اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر صالح بابا کے نام سے مشہور ہوئے اور خود بھی رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنے ... بلند کر دا ...

روحانی کمالات سے متاثر ہو کر ان کے مرشد سید صاحب نے اپنی بیٹی کی شادی بھی ان سے کر دی تھی۔ ان صالح بابا نے کئی دفعہ پیدل حج کیا تھا جس کی وجہ سے ان کا لقب ہی بابا لولی حج یعنی حج کا عاشق پڑ گیا تھا۔ بابا لولی حج کا شمار کشمیر کے مشائخ میں ہوتا ہے۔ یہ کشمیر کے مشہور بزرگ بابا نصیر الدین سے بیعت تھے۔ علامہ کے اجداد میں ایک اور بزرگ شیخ اکبر کا نام بھی لیا جاتا ہے جو پیری اور درویشی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ لیکن ان کے حالات تفصیل سے اور وثوق سے معلوم نہیں ہیں۔

علامہ کے پردادا کا نام شیخ جمال الدین تھا۔ اِن کے چار بیٹے تھے۔ شیخ عبدالرحمان، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ۔ ان شیخ جمال الدین یا ان کے چار بیٹوں نے کشمیر کے ابتر حالات سے مجبور ہو کر اٹھارہویں صدی کے نصف آخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں ہجرت کی اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ شیخ محمد رفیق کے جو عرف عام میں شیخ رفیقا کہلاتے تھے۔ بچے زندہ نہ رہتے تھے۔ بڑی نذر نیاز اور منتوں کے بعد شیخ نور محمد پیدا ہوئے۔ تو ان کے والدین نے انہیں منت پوری کرنے کے لیے ایک نتھ پہنا دی تھی۔ اسی کی رعایت سے ان کا عرف نتھو پڑ گیا تھا۔ یہی شیخ نور محمد، علامہ اقبال کے والد ماجد تھے۔

شیخ نور محمد کی سیرت

شیخ نور محمد، قد و قامت شکل و صورت اور رنگ رُوپ کے لحاظ سے ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ رسمی طور پر زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ گزر اوقات کے لیے ٹوپیاں سیتے تھے۔ ان کی پاک باطنی اور روحانی کمالات کی اتنی دھوم تھی کہ ان کے اپنے پہنے ہوئے کرتے بچوں کو برکت کے لیے پہنائے جاتے تھے۔ باوجود عالم نہ ہونے کے تصوّف کا ذوق رکھتے تھے۔ اہلِ نظر بزرگوں کی صحبت نے اس ذوق کو اور چمکا دیا تھا۔ تصوّف کے اسرار و رموز پر ان کی بڑی نظر تھی۔ اکثر ذکر

فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ اسی لیے انہیں ان پڑھ فلسفی کہا جاتا تھا۔ اپنے ذوق و شوق سے روحانیت کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ صرف نام ہی نور محمد نہ تھا۔ وہ سراپا نور محمد تھے اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ خود اقبال نے ان کی بعض کرامتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں نے والدہ کی زبانی سُنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والدہ کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے۔"

ذکر اقبال نامی کتاب میں مذکور ہے:

اقبال نے بتایا کہ جب میری عمر کوئی گیارہ برس کی تھی کہ ایک رات اپنے کمرے میں کسی آہٹ سے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں میں فوراً بستر سے اُٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے پیچھے چلتے سامنے دروازہ کے پاس پہنچا جو آدھا کھلا تھا اور اس میں سے روشنی آ رہی تھی۔ والدہ دروازہ میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوتے ہے میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سُلا دیا۔ صبح ہوئی تو سب سے پہلے میں والد کے پاس پہنچا۔ تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا خواب سُنا رہے تھے۔ جو انہوں نے رات کو بحالت بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کچھ میل کے فاصلہ پر مقیم ہوا ہے اس قافلہ میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگہ منگوایا مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیتے۔ چند گھنٹوں میں تانگہ اس مقام پر پہنچ گیا

جہاں کارواں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور مقتدر خاندان پر مشتمل ہے جس کے افراد ایک عزیز کا علاج کرانے کے لیے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگہ سے اترتے ہی دریافت کیا کہ قافلہ کا سردار کون ہے جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ قافلہ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس پہنچنا چاہتا ہے وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا جب والد مریض کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے اور اس کے بعض اعضا اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضا پر مل دی اور کہا اللہ تعالیٰ کے فضل کرم سے مریض کو شفا حاصل ہو گی اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین کو یقین ہوا ہو گا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد صاحب کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ سیالکوٹ واپس آ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہوا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس مریض شفایاب ہو چکا ہے"۔

شیخ نور محمد کی عادات و اطوار اور مشاغل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب حال صوفی بھی تھے۔ حد درجہ متقی اور پرہیزگار۔ خوف خدا اور عشق رسول میں سرشار۔ اقبال نے ان کی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک واقعہ اپنی فارسی کی نظم رموز بیخودی میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"بچپن کی بات ہے ایک فقیر نے دروازے پر صدا لگائی اور بغیر کچھ لیے ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ بے قابو ہو کر اُسے ہاتھ سے مارا۔ اس سے جو کچھ اس کی جھولی میں پہلے سے تھا وہ بھی گر پڑا۔ والد نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور گلوگیر لہجے میں فرمایا۔

"قیامت کے دن جب رسول کریم کے چاروں طرف ساری امت جمع ہو گی۔ غازی، شہید، زاہد، عالم، حافظ، عابد، سب موجود ہوں گے اور یہ مظلوم فقیر آقائے نامدار کے سامنے تمہارے اس ظلم کی فریاد کرے گا۔ اور آنحضرت مجھ سے پوچھیں گے کہ ہم نے ایک بندۂ مسلم کو تری فرزندی اور نگہداشت میں دیا تو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا تو میں کیا جواب دوں گا؟ اے نور نظر، تو امت محمدی کا ایک فرد ہے تجھے اخلاق محمدی سے بہرہ ور ہونا چاہیے اور سراپا شفقت و رحمت بننا چاہیے نہ کہ ظلم و فرعونیت کا نمونہ"۔

اقبال اپنے والد کی تصوف سے گہری دلچسپی کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

پرسوں شام (والد) کھانا کھا رہے تھے کسی عزیز کا ذکر ہو رہا تھا جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دوران گفتگو کہنے لگے کہ معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے۔ اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تقریباً بے ہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی"۔

شروع شروع میں شیخ صاحب کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ کرتے اور ٹوپیاں سی کر گزارا کرتے تھے۔ لیکن بعد کو یکایک دن پھر گئے۔ یہ دن پھرنا بھی کرامت سے کم نہ تھا۔ اس سلسلے میں خود اقبال سے ایک واقعہ منقول ہے فرماتے ہیں:۔

"میرے والد ایک روز گھر آ رہے تھے ہاتھ میں رومال تھا۔ رومال میں تھوڑی سی مٹھائی تھی۔ اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے اس کی یہ حالت دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا، مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی۔ جب مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے پانی کی طلب ہے۔ والد ماجد نے لے

کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا۔ رات کو سوتے میں خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے جس میں مٹھائی کے طبق کے طبق رکھے ہیں صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ اس نیک عمل کا ثمر تھا جو کل اِن سے سرزد ہوا - چنانچہ اس روز سے انہیں یقین ہوگیا کہ ان کے دن پھرنے والے ہیں۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے ان کا نام شیخ اکبر تھا ایک مرتبہ ان کے مریدوں میں سے ایک آدمی ان کے پاس آیا اور کہنے لگا آپ دھسّوں (کشمیری کمبل) کی تجارت کیوں نہیں کرتے۔ اس زمانے میں دھسّوں کی قیمت دو روپے فی دھسّہ سے زیادہ نہیں تھی۔ والد صاحب نے کوئی دو چار سو دھسّے تیار کیے تو خدا کی قدرت ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں بک گئے۔ حالانکہ فی دھسّہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی۔ دو چار سو دھسّے بک گئے تو کافی روپیہ جمع ہوگیا۔ بس یہ ابتدا تھی۔ ہمارے دن پھرنے کی۔"

یہ مختصر احوال ہے علامہ کے والد شیخ نور محمد کا جو اپنے خاندان میں میاں جی کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے جو خبر میں نہیں تو نظر میں یکتا ضرور رہے۔ ان کا انتقال بڑی عمر میں ۱۷۔ اگست ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ لیکن علامہ کی والدہ بھی اپنے اتقاء اور پرہیز گاری میں کچھ کم نہیں تھیں۔ ان کا تعلق ضلع سیالکوٹ کے ایک موضع سمبڑیال کے ایک معزز کشمیری گھرانے سے تھا۔ ان کا نام امام بی بی تھا۔ لیکن خاندان میں اپنی شائستگی اور بزرگی کی وجہ سے "بے جی" کے نام سے معروف تھیں۔ لکھنا پڑھنا تو وہ بھی نہیں جانتی تھیں لیکن نماز روزے کے ساتھ تمام امور شریعت پر عامل تھیں۔ پرہیز گاری اور دیانت کا یہ عالم تھا کہ محلے کی عورتیں آپ کے پاس اپنے زیورات اور دوسری قیمتی اشیاء امانت کے طور پر رکھا کرتی تھیں۔ ہمدردی اور خدا ترسی کی یہ صورت تھی کہ اپنے گھر غریب بچیوں کی کفالت کرتیں اور انہیں پال پوس کے بڑے اہتمام سے ان کی شادیاں کر دیتیں۔

ان امام بی بی کا احساس پرہیزگاری اس درجہ کا تھا کہ اپنے شوہر شیخ نور محمد کی اس تنخواہ سے ایک حبّہ بھی اپنے صرف میں نہیں لاتی تھیں۔ جو انہیں سیالکوٹ کے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی سے ملا کرتی تھی۔ جہاں وہ کپڑے سینے پر ملازم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصّہ شرعاً جائز نہ تھا۔ اس لیے وہ اس تنخواہ کو استعمال میں لانا جائز نہیں سمجھتی تھیں جو شیخ صاحب کو اپنی محنت کے عوض وہاں سے ملا کرتی تھی۔ اللہ اکبر۔ یہ عالم تھا ان کے تقوے کا۔

اقبال اپنے والد گرامی کا بھی کم احترام نہیں کرتے تھے لیکن اپنی والدہ سے انہیں عشق کی حد تک عقیدت تھی اور ان کا انتہائی ادب ملحوظ رکھتے تھے۔

اقبال کے نواسے خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب "اقبال درون خانہ" میں لکھا ہے کہ جب کبھی اقبال سیالکوٹ جاتے تو سب سے پہلے بے جی کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے اور گلے لگا کر ملتے۔ وہ بھی انہیں بچوں کی طرح پیار کرتیں اور سر پہ ہاتھ پھیرتیں اور پیشانی کو بوسہ دیتیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ سب سے پہلے قبرستان امام صاحب میں ان کی قبر پر جاتے۔ فاتحہ کے بعد دیر تک قرآن خوانی کرتے رہتے۔

اقبال کو اپنی والدہ ماجدہ سے کیا تعلق تھا اور انہیں اپنی زندگی میں کیا درجہ دیتے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ اس لاجواب مرثیے سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی وفات کے بعد والدہ مرحومہ کی یاد کے عنوان سے لکھا۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اپنی نیک سیرت عارفہ ماں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

اقبال نے اپنے بیٹے جاوید کو اپنے گھرانے کے مزاج کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے۔

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو　　ہے اس کا مذاق عارفانہ

اس عارفانہ ماحول میں اقبال پیدا ہوتے تھے ان کے بڑے بھائی کا نام شیخ عطا محمد تھا۔ اقبال ان کا بھی بڑا احترام کرتے تھے اور ان کے احسان مند بھی تھے کہ انہوں نے ہی ان کی یورپی تعلیم کے تمام اخراجات برداشت کیے تھے۔ والدہ مرحومہ کے مرثیے میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا تذکرہ بھی بڑے خلوص سے کیا ہے۔ عقائد کے اختلاف کے باوجود وہ ان کا بہت لحاظ کرتے تھے۔

ذکر اقبال میں لکھا ہے:۔

ان کی ماں کے انتقال پر جب دوست احباب ان کی تعزیت کے لیے ان کے پاس گئے تو وہ دیر تک اپنی والدہ کی خوبیاں بیان کرتے رہے اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے تھے۔ فرمایا:۔

جب میں سیالکوٹ جاتا تھا تو والدہ خوش ہو کر فرماتیں:۔

"میرا بال آگیا" تو میں ان کے سامنے اپنے آپ کو ایک ننھا سا بچہ محسوس کرنے لگتا تھا

پیدائش، بچپن اور تعلیم

مشہور مردم خیز شہر سیالکوٹ کے قدیم بازار چوڑی گراں میں سڑک کے کنارے ایک محلہ ہے۔ چودھری وہاب (جو اب اقبال اسٹریٹ کہلاتا ہے) اس میں علامہ

کے دادا شیخ محمد رفیق نے ۱۸۶۱ء میں ایک مکان خریدا تھا۔ جس میں گلی کی طرف ایک ڈیوڑھی، دو کوٹھڑیاں اِن کے ساتھ ایک دالان اور چھوٹا سا صحن تھا۔ پرانی وضع کے اس چھوٹے سے مکان کے ایک کونے میں اقبال پیدا ہوئے تھے۔ نومبر ۱۸۷۷ء کی ۹ تاریخ تھی۔ صبح صادق کا وقت تھا اور جمعہ کا دن۔ قمری حساب سے سال ۱۲۹۴ھ اور ذیقعد کی ۳ تاریخ روشن ضمیر ماں نے محمد اقبال نام رکھا۔ جسے دُعا سمجھ کے شانِ کریمی نے قبول کر لیا۔ برسوں بعد اقبال نے کہا:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کا سب سے زیادہ اطلاق خود اقبال پر ہوتا ہے۔ اقبال کی پیدائش ایک دیدہ ور کی پیدائش تھی۔ اور ایک عطیہ خداوندی۔ اقبال کی پیدائش سے پہلے ان کے والد کو ایک خواب کے ذریعہ بشارت دی گئی تھی۔ وہ خواب خود شیخ صاحب نے یوں بیان کیا ہے:۔

"میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ اکٹھے ہیں۔ سطح زمین سے تھوڑی بلندی پر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اُڑ رہا ہے۔ اس کی دل کشی و دل فریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اُٹھا اُٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اترا اور میری گود میں آن گرا"۔ صاحب نظر شیخ نور محمد صاحب نے خود ہی اس کی تعبیر بھی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمت اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔"

کچھ اس بشارت سے اور کچھ اپنی طبعی فراست سے شیخ صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک غیر معمولی بچہ سے نوازا ہے. جو اسلام کی غیر معمولی خدمت سرانجام دے گا. اس لیے ان کی تربیت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے. اور ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ایک واضح اور بلند مقصد ان کے پیش نظر تھا. خود اقبال نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے ان کے والد ماجد کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہوتی ہے. فرماتے ہیں :

جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا. والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پاکر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتلاؤں گا. بالآخر انہوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی ایک دن صبح کو جب میں حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا میرے پاس آئے اور فرمایا "بیٹا! کہنا یہ تھا کہ تم جب قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اُترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے". اقبال بچپن میں کی گئی درویش صفت لیکن عارف باللہ باپ کی نصیحت کو کبھی بھولے نہیں. برسوں کے بعد جب اُنہوں نے کہا.

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے صاحبِ کتاب نہیں

تو یقیناً وہ اسی نصیحت کو اپنی بصیرت کی روشنی میں دہرا رہے تھے. اقبال کی عمر ابھی دو سال ہی کی تھی کہ کسی بیماری میں کنپٹی میں ان کے جونکیں لگائی گئیں جس سے داہنی آنکھ کا خون خاصی مقدار میں نکل گیا اور بصارت تقریباً زائل ہو گئی. اس نقص کی وجہ سے وہ بعد کو سول سروس کے طبی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے. اگرچہ بعد کے

حالات نے بتایا کہ ان کا طبی امتحان میں ناکام ہونا بھی حکمت سے خالی نہ تھا۔ لیکن بائیں آنکھ کی بینائی غیر معمولی طور پر تیز تھی اور آخری عمر میں موتیا اترنے تک تیز رہی اور کبھی انہیں بصارت کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔

ابتدائی تعلیم

چار پانچ برس کی عمر میں اقبال کی بسم اللہ ہوئی اور انہوں نے روایتی طریقے سے قاعدہ بغدادی سے پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں سیالکوٹ میں تعلیم کے چار اہم مرکز تھے۔ ان میں سے تین میں صرف عربی و دینیات کی تعلیم کا انتظام تھا۔ ان تین مدرسوں میں ممتاز حیثیت مولانا غلام حسن کے مدرسے کی تھی۔ چوتھا مدرسہ مولوی میر حسن کا تھا جس میں عربی، فارسی ادب کی تدریس کا انتظام بھی تھا۔ چونکہ شیخ نور محمد اکثر مولانا ابو عبداللہ غلام حسن کے مدرسے میں وعظ سننے جایا کرتے تھے اور ان کا اپنا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں اس لیے انہوں نے اقبال کو مولانا غلام حسن کے ہاں پڑھنے بٹھا دیا۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے ایک دن اقبال کو وہاں دیکھ کر پوچھا یہ کس کا بچہ ہے؟ جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا بیٹا ہے تو آپ نے شیخ صاحب سے اصرار سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ اسے میں پڑھاؤں گا۔ چنانچہ اقبال مولانا سید میر حسن کے سپرد ہو گئے۔ اقبال کا ایک روایتی مدرسے سے اٹھ کر ایک جدید تر درسگاہ میں آنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ اس عظیم ذہنی تربیت کی ابتدا تھی جس کی انتہا یورپ کی بہترین دانشگاہوں میں فلسفہ و الٰہیات کی تعلیم پر ہوئی۔ مولوی

میر حسن نہ صرف فارسی عربی کے بہت بڑے عالم تھے بلکہ ایسے باکمال استاد تھے کہ اپنے شاگردوں میں ان زبانوں کا صحیح ذوق بھی پیدا کر دیا کرتے تھے۔ اقبال نے ان سے اسکول و کالج میں بھی مدتوں استفادہ کیا۔ اقبال کی تعلیم و تربیت میں مولوی میر حسن کا حصہ بہت اہم اور بنیادی ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ مولوی سید میر حسن کے سر سید سے قریبی دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔ مولوی میر حسن سیالکوٹ پنجاب میں سر سید کی تحریک کے علم بردار تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ نوجوان اقبال سر سید سے شعوری طور پر نہیں تو لاشعوری طور پر ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ آگے چل کر جب اقبال نے اپنی نظم "سر سید کی لوح تربت" لکھی تو سر سید سے ان کی گہری عقیدت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

کچھ عرصہ مولوی میر حسن کے مدرسہ میں پڑھنے کے بعد انہیں کے مشورے پر اقبال کو اسکاچ مشن سیالکوٹ میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں بھی انہیں مولانا سے پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ کبھی کبھی دینیات کے درس کے لیے مولانا غلام حسن کے ہاں بھی چلے جایا کرتے تھے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اقبال کی ذہانت اور فراست بچپن ہی سے عیاں تھی۔ اقبال کی بھابھی (شیخ عطا محمد کی اہلیہ) کا بیان ہے کہ "اقبال چھوٹی عمر میں بھی بے حد ذہین تھے اور شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت کمر بند بنا کرتی تھی اور اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ہمیں ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ سناتے سناتے ایک آدھ مصرعہ خود بھی لگا دیتے۔ جس سے لطف دوبالا ہو جاتا۔ ہم گھر کی عورتیں حیرت میں آجاتیں اور بہت تعریفیں کرتیں۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی تھی۔"

ان ہی خاتون سے روایت ہے :۔

"ایک دفعہ آدھی رات کے قریب بے جی (اقبال کی والدہ) کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ تو انہوں نے کم سن اقبال کو دیئے کے قریب سکول کا کام کرتے ہوئے پایا۔ دو ایک آوازیں بھی دیں لیکن وہ ہلے جلے نہیں تو انہوں نے اٹھ کر کندھوں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا: بیٹے اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو۔ اٹھو، سو جاؤ، صبح کام کر لینا۔ اقبال تھوڑے کسمسائے اور جواب دیا، بے جی! سویا ہوا تو ہوں"۔ اب تو بے جی کو وہم ہو گیا۔ روز رات کو کئی کئی بار اٹھ کر دیکھتیں اور اکثر انہیں اسی حالت میں پاتیں اور اٹھا کر سلاتیں۔ صبح کو جب اقبال سے پوچھا جاتا تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ سوتے میں وہ حساب کے جو سوالات نکالتے وہ بالکل ٹھیک ہوتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد بے جی کی توجہ سے ان کی یہ عادت جاتی رہی"۔

اقبال کی ذہانت کا ایک واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک روز وہ جماعت میں ذرا دیر سے پہنچے۔ استاد نے باز پرس کی۔ اقبال نے برجستہ کہا "جناب، اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے"۔ یہ حاضر جوابی صرف شوخی کا رنگ لیے ہوئے نہیں ہوتی تھی اس کا اظہار سعادت مندی کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ سکاچ مشن سکول کے زمانے میں اقبال اپنے استاد محترم مولوی میر حسن کے گھر کے لیے بازار سے سودا سلف خرید کر واپس آئے تو راستے میں مولوی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے کہا میں کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ بازار سے ہمارے گھر کے لیے سودا سلف نہ لایا کرو تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں اس پر اقبال نے مسکرا کر جواب دیا، "جناب! میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں"۔

شوخی، شرارتیں کھیل تماشے اقبال کے بچپن کا حصہ بھی تھے۔ اقبال کی چھوٹی

ہمشیرہ کریم بی بی فرماتی ہیں کہ اقبال بھائی کو بچپن میں میری گڑیوں سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ ہر وقت ان کی تاک میں لگے رہتے اور جب بھی داؤ چلتا ان کے ناک کان کاٹ دیتے۔ آنکھیں پھوڑ دیتے۔ یا یوں ہی پرزے پرزے کر دیتے۔ اسی طرح بچپن میں انہیں بٹیرین اور کبوتر پالنے اور اکھاڑے میں زور کرنے کا شوق بھی تھا۔ کبوتروں اور پہلوانی سے تو ان کی دلچسپی آخر عمر تک رہی۔

"یاد اقبال" میں ہے کہ مولوی میر حسن کے صاحب زادے سید ذکی اور ایک محلے دار خوشیا ان کے بے تکلف دوست تھے۔ سید ذکی اور اقبال ایک ساتھ کبوتر اڑایا کرتے تھے۔ تیسرے دوست خوشیا جو اقبال کو بالا کہا کرتے تھے، صرف شطرنج ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ کبوتر بازی سے انہیں (خوشیا کو) کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اکثر اقبال سے کہا کرتے "بالے یار، چھوڑ اس جھنجھٹ کو، کبوتر بازی میں کیا رکھا ہے"۔ وہ ہر بار ہنس کر جواب دیتے "خوشیا! نیلگوں فضا کی لامحدود وسعتوں میں کبوتر اڑتا ہوا دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں خود بھی ان کے ساتھ آسماں کی رفعتوں میں محو پرواز ہوں۔ اس وقت میرے اندر عجیب ولولہ اور جوش پیدا ہو جاتا ہے"۔

انہی خوشیا نے اقبال کی وفات کے بعد ایک انٹرویو میں اقبال کے بچپن کا ایک معنی خیز واقعہ بیان کیا ہے۔ جس میں ان کے بچپن کے کردار پر خصوصی روشنی پڑتی ہے۔ خوشیا کہتے ہیں۔

"بالے سے میری لڑائی زندگی میں صرف ایک بار ہوئی ہم دونوں نے دوسرے دوستوں سے چھپ کر امام صاحب کا میلہ دیکھنے کا پروگرام بنایا دو آنے بالے نے

گھر سے پیسے اور میں نے والدہ اور والد سے لڑ جھگڑ کر اٹھنی حاصل کی. میلے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اٹھنی بالے کو دے دی. کیونکہ وہ پیسے بڑی احتیاط سے رکھتا تھا. میلے میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں نے اس سے کہا یار کچھ کھانا پینا چاہیئے. بالے نے مسکرا کر جواب دیا لیکن میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں. میں نے حیران ہو کر پوچھا. کیا مطلب؟ اس نے بڑے اعتماد سے کہا:۔

میں نے تمام پیسے اس اندھے فقیر کو دے دیے ہیں جو رو رو کر میلہ دیکھنے والوں کو امداد کے لیے پکار رہا تھا. مجھے غصہ آگیا اور میں نے بڑے درشت لہجے میں کہا. اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کی جھولی میں ڈال دینا کہاں کی شرافت ہے. تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ تم میری اجازت کے بغیر میری اٹھنی اس اندھے فقیر کو دے دیتے. تم نے میرے ساتھ بددیانتی کی ہے۔

بالے نے میرے یہ فقرے سُنے اور کوئی بات کہے بغیر بھیڑ میں گم ہو گیا اس کے بعد پورے دو ماہ ہم ایک دوسرے سے نہ بولے. اگرچہ مجھے اس قطع تعلق سے سخت ذہنی کوفت تھی لیکن میں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا کہ قصور اس کا تھا پہلے وہ بات کرے۔ دوسری طرف غالباً اس کو بھی اپنی آن کا پاس تھا. ایک روز میں شام کے وقت گھر پہنچا تو والدہ نے مجھے بتایا کہ بالا آیا تھا اور تمہارے لیے ایک اٹھنی دے گیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرمندگی ہوئی. میں اسی وقت مولوی میر حسن کے یہاں پہنچا. بالا مجھے دیکھتے ہی کمرے سے باہر آیا اور بڑے تپاک سے ملا۔ اس سے پہلے میں کوئی بات کرتا اُس نے ہنس کر کہا تمہاری اٹھنی تمہیں واپس مل گئی. اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"

بظاہر اس معمولی سے واقعہ سے نوعمر اقبال کی نفسیات اور کردار پر خاص روشنی

پڑتی ہے۔ خدا ترسی اور عزت نفس کا تحفظ یہ وہ دو خصوصیات تھیں جو آگے چل کر ان کے کردار کا جزو لا ینفک بنیں۔ یہ دونوں خصوصیات ان کے اندر بچپن میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور ایک طرح سے انہیں ورثے میں ملی تھیں اور غالباً درویش صفت عابد و زاہد اور عارف والدین کی وجہ سے ان میں بھی روحانی کمالات کے اثرات آ گئے تھے کہ اس عمر میں بھی وہ بزرگوں کی توجہ کا مرکز تھے۔ مولوی میر حسن نے ان کی پیشانی پر اوج کمال پر پہنچنے کے آثار دیکھ کر ہی انہیں اپنے مدرسہ میں اپنے زیر تربیت بلانے پر اصرار کیا تھا۔ اور پھر اسکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں داخل کرایا تھا۔ یہیں ایک درویش نے ان پر دست شفقت پھیرا۔ اقبال کے نواسے خالد نظیر صوفی اپنی کتاب اقبال درون خانہ میں لکھتے ہیں کہ جب علامہ اسکاچ مشن سکول میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھ رہے تھے تو ایک روز ان کی کلاس میں ایک بلند و بالا، سرخ و سپید اور اپنے حال میں مست ایک مرد قلندر آن وارد ہُوا۔ اور بڑی شفقت سے اقبال کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ جب اُستادوں نے اقبال سے اس درویش کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک ہوتے تھے اور مولانا میر حسن بھی منع نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا کم بخت، اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ذرا اسے

پکڑ کر تو دیکھتے۔

اقبال نے اسکاچ مشن سکول سے پرائمری پانچویں جماعت کا امتحان ۱۸۸۷ء میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور وظیفہ لیا۔ ۱۸۹۱ء میں اسی سکول سے پنجاب یونیورسٹی کا انیگلو ورنیکلر مڈل سکول کے امتحان میں بھی امتیاز حاصل کیا اور وظیفے کے مستحق ٹھہرے۔

شاعری کی ابتدا اور پہلی شادی

اقبال کی بھابھی کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ بچپن ہی سے اقبال کی زبان سے کلام موزوں نکلنے لگا تھا اور وہ شعر خوانی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ پہلے پنجابی میں شعر کہنا شروع کیا پھر مولوی میر حسن کے کہنے پر اردو میں کہنے لگے۔ ۱۸۹۲ء میں باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ اسی سال جب وہ نویں درجہ میں تھے تو انہوں نے اس زمانے کے سب سے مشہور شاعر داغ دہلوی سے کلام میں اصلاح لینے کا سلسلہ شروع کیا۔ نومبر ۱۸۹۳ء میں دہلی کے ایک رسالہ "زبان" میں انکی ایک غزل بھی شائع ہوئی۔ اس زمانے میں وہ سیالکوٹ میں ہونے والے اردو مشاعروں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۹۳ء کے اوائل میں میٹرک کا امتحان دینے گجرات گئے اور اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ کے طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ سکول کی طرف سے تمغہ دیا گیا اور وظیفہ بھی لیا۔

اپریل ۱۸۹۳ء میں گجرات کے سول سرجن خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان کی بیٹی کریم بی بی سے شادی بھی ہو گئی۔ یہ نوعمری کی شادی اُن کے والدین کی پسند کا نتیجہ تھی۔ کریم بی بی اپنے والدین کے ساتھ مکہ معظمہ میں پلی بڑھی تھیں اس لیے ماں بیٹی کی دوسری زبان عربی تھی۔ ان پہلی بی بی سے ان کے دو بچے ہوتے تھے۔ ایک معراج بیگم جنہوں

نے جوانی میں انتقال کیا۔ دوسرے آفتاب اقبال جنہوں نے زیادہ تر ننھیال میں پرورش پائی اور لندن سے بیرسٹری کی سند لی (افسوس ہے کہ ان پہلی بی بی سے یورپ سے واپس آنے کے بعد ان کی نبھی نہیں اور بیٹے آفتاب سے کوئی خاص تعلق نہ رہا)

۷ مئی ۱۸۹۳ء کو اقبال نے اسکاچ مشن سکول میں جو اب انٹر کالج بن چکا تھا۔ گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا۔ کالج میں داخلہ لیتے وقت ان کے والد شیخ نور محمد نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ تکمیل تعلیم کے بعد اپنی ساری زندگی اسلام کے لیے وقف کر دیں گے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس عہد کو اقبال نے کس جمال اور کمال سے پورا کیا۔ اس کی گواہی خود شیخ نور محمد نے بھی دی۔ ان کی آخری علالت کے زمانے میں اقبال نے ان سے پوچھا۔ میں نے آپ سے اسلام کی خدمت کا جو عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ بوڑھے درویش صفت باپ نے فخر اور اطمینان سے کہا۔ "ہاں بیٹے، تم نے حق ادا کر دیا۔"

اسکاچ مشن کالج میں (جو ابھی تک مرے کالج کے نام سے موسوم نہیں ہوا تھا) انہیں مولوی میر حسن سے استفادے کا موقعہ ملتا رہا اور ذوق شعر اور طرز فکر کی تربیت بھی ہوتی رہی یہیں سے ۱۸۹۵ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کا انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ چونکہ اس وقت تک اسکاچ مشن کالج میں بی اے کی کلاسیں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے مزید تعلیم کے لیے انہیں لاہور آنا پڑا۔

اقبال لاہور میں

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لیا۔ بی اے میں ان کے مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔ گورنمنٹ کالج کے کواڈرنگل

ہوسٹل (جو اب اقبال ہوسٹل کے نام سے موسوم ہے) کے کمرہ نمبر ایک میں قیام کیا۔ اسی سال دسمبر ۱۸۹۵ء میں انہوں نے اندرون بھاٹی دروازہ میں منعقدہ اُردو بزم مشاعرہ میں پہلی بار شرکت کی۔ لاہور کی ادبی و ثقافتی زندگی سے یہ ان کا پہلا تعلق تھا جو مدت العمر قائم رہا۔ ۱۸۹۶ء کے اوائل میں انہوں نے انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی رکنیت اختیار کی۔ اس رکنیت کی اہمیت یہ ہے کہ اس عمر میں جب کہ وہ پورے بیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے انہوں نے محدود پیمانے پر قومی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔

۱۸۹۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ لیکن عربی کے مضمون میں اوّل آنے پر یونیورسٹی نے انہیں خان بہادر ایف ایس جلال الدین گولڈ میڈل عطا کیا۔ اسی طرح ایک تمغہ انگریزی میں اوّل آنے پر ملا۔ وظیفہ اس پر مستزاد تھا۔ اسی سال اقبال نے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا۔ مولوی میر حسن کے مدرسے میں داخل ہونے کے بعد یہ ان کی زندگی کا دوسرا اہم قدم تھا۔ ایم اے میں انہیں فلسفہ، تاریخ اور اسلامیات کے جید عالم اور ماہر پروفیسر تھامس آرنلڈ سے استفادے کا موقعہ ملا۔ آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور میں آنے سے پہلے علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد رہ چکے تھے اور مولانا شبلی جیسے عالم اور فاضل سے انہوں نے عربی پڑھی تھی وہ فلسفہ ہی کے نہیں اسلامی تاریخ کے بھی بڑے عالم تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال جیسے جوہر قابل کی تربیت خود قدرت بڑے اہتمام سے کر رہی تھی۔ درویش صفت عارف باللہ باپ اور فرشتہ سیرت ماں نے ان کے قلب کو اسلام اور عشق رسول سے روشن کیا۔ مولوی میر حسن ایسے استاد نے ان کے ادبی و شعری ذوق کی تربیت کی اور اب فلسفہ کی تعلیم کے لیے انہیں آرنلڈ ایسا یگانہ روزگار عالم ملا۔ آرنلڈ نے ان کی خداداد صلاحیتوں کو چمکا دیا اور فلسفہ

کے اسرار درموز سے ان کو آشنا کر دیا ایک اچھا شاگرد اُستاد کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اقبال نے بھی آرنلڈ کو متاثر کیا۔ وہ اقبال کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق، اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ اقبال آرنلڈ سے اتنے متاثر تھے کہ جب آرنلڈ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنی مشہور نظم "نالۂ فراق" لکھی ۔

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کوارڈرینگل کا کمرہ نمبر ایک جس میں اقبال مقیم تھے اس زمانے میں ممتاز ترین کمرہ تھا۔ ادبی و تفریحی محفلیں اسی کمرے میں جمتی تھیں اور اقبال جانِ محفل بنتے تھے۔ شعر خوانیاں ہوتی تھیں ۔ اقبال عام طور پر لاہور کے مشاعروں میں نہ جاتے تھے لیکن ایک دفعہ ان کے ساتھی انہیں کھینچ کر ایک مشاعرہ میں لے گئے جس میں خاندان تیموری کی یادگار مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے۔ اقبال نے جب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد اچھل پڑے اور کہنے لگے۔ اقبال اس عمر میں یہ شعر؟ ایک دو دفعہ اور بھی اقبال نے اس مشاعرے میں غزلیں پڑھیں تو لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ شیخ عبدالقادر کے ساتھ اُن کے اسی زمانے میں دوستی کے تعلقات قائم ہوتے ۔

۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان ہند لاہور کے ایک اجلاس میں پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع تھا:۔

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزون

اور مقطع تھا:۔

جو تری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھے اقبال صورتِ مضمون

اس وقت اقبال نے بی اے بھی پاس نہ کیا تھا اور ان کی عمر پورے بیس برس بھی نہ ہوتی تھی۔
لاہور کی طالب علمی کے زمانے (۱۸۹۸ء) میں اقبال چھٹیوں میں سیالکوٹ گئے ہوئے تھے کہ سرسید احمد خان کے انتقال کی خبر آئی۔ سرسید اور سید میر حسن شاہ کے گہرے تعلقات رہے تھے انہیں بہت صدمہ تھا وہ کالج جا رہے تھے کہ راستے میں اقبال مل گئے۔ آپ نے فرمایا۔ سرسید فوت ہو گئے ہیں۔ ذرا تاریخ وفات کی فکر کرنا۔ اقبال رحیم بخش کی دکان پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد اپنے دوست مولانا میر حسن کے بیٹے سید ذکی شاہ سے کہنے لگے تاریخ وفات ہو گئی ہے جاؤ ابھی شاہ صاحب کو سنا دو تاریخ تھی۔ انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک، ذکی شاہ نے یہ تاریخ شاہ صاحب کو جا کر سنائی۔ تو انہوں نے فرمایا۔ خوب میں نے بھی ایک تاریخ نکالی ہے۔ غفرلہٗ یہ دونوں تاریخیں مولانا حالی نے سرسید کی سوانح حیات، حیات جاوید، میں درج کی ہیں۔

ایم اے فلسفہ میں انہوں نے ۱۸۹۷ء میں داخلہ لیا تھا۔ اس زمانے میں ایم اے کا امتحان ایک سال میں ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں امتحان نہ دے سکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس سال لاہور کے لاء اسکول میں (جو بعد میں لاء کالج کہلایا) داخلہ لے لیا تھا۔ دسمبر ۱۸۹۸ء

میں قانون کا ابتدائی امتحان دیا لیکن اصول قانون کے پرچے میں ناکام ہو گئے۔ قانون کے امتحان میں ناکامی کے بعد انھوں نے پھر فلسفے کے امتحان کی طرف توجہ کی۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا لیکن یونیورسٹی میں اس سال واحد کامیاب امیدوار ہونے کی وجہ سے اول آنے پر انہیں نواب علی بخش گولڈ میڈل دیا گیا۔

ایم اے میں داخل ہونے کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک عالم دین نے جھوٹ بولا۔ اقبال کی دینی حمیت کو سخت صدمہ پہنچا۔ لہذا وہ کئی دنوں تک بے چین و بے قرار رہے۔ ان کا ذہنی اضطراب اتنا شدید تھا کہ پڑھائی میں بھی ان کا دل نہ لگتا تھا۔ آرنلڈ نے اس الجھن کو بھانپ لیا اور پوچھا کیا بات ہے؟ اقبال نے پورا واقعہ سنایا تو پروفیسر آرنلڈ نے کہا "تم آیندہ زندگی میں اس قسم کے بہت سے واقعات دیکھو گے"

ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد جون ۱۹۰۰ء میں چیف کورٹ میں انھوں نے پھر درخواست دی کہ انہیں دسمبر ۱۹۰۰ء کے ابتدائی قانونی امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے اور دوبارہ لیکچروں کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اقبال نے انگلستان میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

عملی زندگی کا آغاز

۱۸۹۹ء میں بائیس برس کی عمر میں فلسفہ میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد اقبال کو لاہور کے مشہور تعلیمی ادارے اورنٹیل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ اس طرح عربی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے اقبال نے اپنی عملی زندگی

کا آغاز کیا۔ ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اقبال جو آگے چل کر تمام انسانیت کا معلم بننے والا تھا اس نے زندگی میں پہلا قدم ہی معلم کی حیثیت سے اُٹھایا۔ اسی سال نومبر ۱۸۹۹ء میں اقبال پہلی بار انجمن حمایت اسلام لاہور کی مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے۔ انہی ایام میں ان کی پہلی بیوی کریم بی بی سے ان کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال پیدا ہوتے۔

اسی زمانے سے اقبال کی ادبی اور قومی دلچسپیوں میں اضافہ ہونے لگا تھا اور ان کی شہرت بڑھنے لگی تھی اور اس شہرت کا بڑا ذریعہ وہ نظمیں تھیں جو وہ ہر سال التزام سے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھتے تھے۔ ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو پہلی بار اقبال نے اپنی نظم نالۂ یتیم، انجمن کے پلیٹ فارم سے ترنم سے سنائی کچھ سحر انگیز ترنم کا اثر تھا کچھ اقبال کی شخصیت کا اور کچھ نظم کے مضمون اور زبان کا، کہ سننے والے تڑپ اُٹھے۔ اسی سال لاہور کی ایک ادبی مجلس میں شیخ عبدالقادر کے سامنے انہوں نے اپنی مشہور نظم ہمالہ سنائی۔ ۱۹۰۱ء کے اوائل میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں نظم درد دل سنائی۔ اور اپریل ۱۹۰۱ء کے مخزن میں ہمالہ شائع ہوئی اس وقت صورتِ حال یہ تھی وہ انجمن حمایت اسلام کے واسطے سے قومی معاملات میں بھی دلچسپی لے رہے تھے اور ہمالہ جیسی نظم سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وطن پرستی اور متحدہ قومیت کے مروجہ نظریات سے بھی متاثر تھے۔ آئندہ چند سالوں میں وطن پرستی کا یہ رجحان نیا شوالہ اور ترانۂ ہندی جیسی نظموں میں بھرپور انداز میں ظاہر ہوا۔

ملازمت کا سلسلہ یہ رہا کہ ۱۹۰۱ء ہی میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں بھی چھ ماہ انگریزی ادبیات کا درس دیا۔ اسی سال وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان میں شامل ہوتے۔ ایک آنکھ کی بینائی خراب ہونے کی وجہ سے میڈیکل بورڈ نے انہیں فیل کر دیا۔ اکتوبر

۱۹۰۲ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عارضی طور پر انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے اگلے سال جون میں اسی کالج میں انہیں فلسفہ کا اسسٹنٹ پروفیسر تعینات کیا گیا۔ بحیثیت معلم کے وہ بہت کامیاب تھے اور بحیثیت ممتحن کے انہیں بے حد سخت سمجھا جاتا تھا۔ وہ نمبروں کے معاملہ میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ کسی سفارش کو خواہ سائل کتنی ہی ہمدردی کا مستحق نہ ہو کبھی قبول نہ کرتے تھے۔ فرماتے "نالائق نوجوان میری قوم میں سے نہیں ہیں۔"

ان ہی دنوں جنوری ۱۹۰۲ء کے مخزن میں اقبال کا ایک مضمون شائع ہوا عنوان تھا "بچوں کی تعلیم و تربیت" اس میں تعلیم کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال نے اصرار سے کہا ہے بچوں میں سوچنے کی قوت کو خاص طور سے تقویت دینا چاہیے۔ اسی مضمون میں استادوں اور معلمی کے پیشے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور اُن کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کے ہاتھ میں ہے سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلم کی کارگزاری ہے۔"

۱۹۰۳ء میں اقبال کی پہلی تصنیف علم الاقتصاد شائع ہوئی یہ اُردو میں "معاشیات" پر پہلی مستند کتاب ہے اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر کتنی وسیع تھی اور ملکی ترقی میں اقتصادی مسائل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا انہیں پورا شعور تھا۔ ۱۹۰۴ء میں ایبٹ آباد میں ایک لیکچر انھوں نے "قومی زندگی" پر دیا۔ مخزن کے مضمون، کتاب علم الاقتصاد، لیکچر قومی زندگی، اور فلسفے، عربی، انگریزی ادب کی پروفیسری کے مشغلوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہ ہوگا کہ اقبال کے فکر و نظر کی تربیت بڑے وسیع اور

ہمہ گیر پس منظر میں ہو رہی تھی۔ لیکن بظاہر شاعری ہی ان کی شخصیت کے اظہار کا خاص ذریعہ بنی ہوئی تھی اور اسی حیثیت سے وہ معروف ہو رہے تھے۔ بازار حکیماں (بھاٹی گیٹ) کے مشاعروں اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے ذریعے سے ان کی شاعری خواص و عوام کی توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ ایک ایسے ہی مشاعرے میں اقبال کا کلام سن کر شبلی نے کہا تھا "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی۔ تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے"۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں "نالۂ یتیم" کو سن کر ڈپٹی مولوی نذیر احمد کہہ اٹھے تھے "میں نے انیس و دبیر کے کئی مرثیے سنے ہیں لیکن اتنی پرسوز نظم نہیں سُنی"۔

شیخ عبدالقادر نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ: (اقبال) اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے میں نے اس زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقّت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سُریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر ان کی زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان

میں خود وہ انہیں قلم بند بھی نہیں کرتے۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونیٔ طبع وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر تھے جب طبیعت خود مائل نظم ہوتی تو جتنے شعر چاہتے کہہ دیتے مگر یہ کہ، ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمائش وہ کچھ لکھ سکیں یہ قریب قریب ناممکن تھا۔"

آغاز شاعری سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کی جو نظمیں بانگ درا میں درج ہیں ان کی تعداد غزلوں کے علاوہ ۴۹ ہے۔ ان میں سے بیشتر نظموں میں تفکر، تلاش اور جستجو کا رجحان غالب ہے کچھ میں مفکرانہ انداز کی مناظر فطرت کی عکاسی ہے بعض انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ اسلوب پر عموماً فارسی کا غلبہ ہے۔ لیکن کچھ نظمیں سادہ وسلیس بھی ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے یہ دور وطن پرستی اور متحدہ قومیت کا دور ہے سوائے ایک نظم "بلال" کے جسے خالص اسلامی تخیل کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۰۳ء میں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس پر اقبال کے ردعمل سے ان کے کردار کے ایک مخصوص پہلو پر خصوصی روشنی پڑتی ہے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کوئٹہ میں ایس ڈی او تھے۔ دشمنوں نے سازش کر کے انہیں ایک فوجداری مقدمے میں پھنسا دیا۔ چنانچہ معطل کر دیئے گئے اور فورٹ سنڈیمن میں حراست میں لے لیا گیا۔ اقبال نے دقتیں اٹھا کر فورٹ سنڈیمن جا کر عطا محمد صاحب سے ملاقات کی اور متعلقہ افسروں کی سازشوں سے آگاہ ہو کر وائسرائے لارڈ کرزن کو خط لکھا کہ وہ اس معاملہ کی خود تحقیقات کرائیں۔ اقبال نے یہ عملی قدم اٹھا کر ایک اور کارروائی بھی کی جو ان کے ذہنی رجحانات کی غماز تھی۔ وہ کارروائی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی منظوم فریاد خواجہ نظام الدین اولیا کے سامنے پیش کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کے بھائی کے معاملہ میں خود انصاف کرے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بلوچستان کے پولیٹیکل ایجنٹ کا تبادلہ ہو گیا اور بالآخر مقدمہ کا فیصلہ ان کے

بھائی کے حق میں ہو گیا۔

گورنمنٹ کالج کی پروفیسری ہی کے زمانے میں اقبال نے علی بخش کو ملازم رکھا جس نے تمام عمر ان کی مثالی وفاداری سے خدمت کی۔

یورپ کا سفر

گورنمنٹ کالج سے تعلیمی رخصت لے کر اقبال یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے یورپ کو روانہ ہوتے اور ۲ ستمبر کو دہلی رک کر نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی اور "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک پرسوز اور پر درد نظم پڑھی۔ پہلا شعر ہے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

آگے چل کر کہا:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

اس کے بعد اپنے اُستاد مکرم مولوی میر حسن کو بڑے خلوص سے خراج عقیدت پیش کیا

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

آخر میں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی اخوت و محبت کی بے انتہا تعریف کی اور ان کے لیے صدق دل سے دعا کی۔

ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں

یہ التجائے مسافر اقبال کی تہہ در تہہ شخصیت کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کو فقرا اور اولیائے اللہ سے جو گہری عقیدت تھی اس کا بھرپور اظہار اس نظم میں ہوا ہے۔ والدین، استاد اور بھائی کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ رسمی نہیں حقیقی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ کے سفر کی غرض و غائیت بھی بیان کر دی ہے اور اپنے فکر و فن کی منزلیں متعین کر دی ہیں۔

فلک نشین صفت مہر ہوں زمانے میں ۔۔۔ تری دُعا سے عطا ہو وہ نردبان مجھکو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے ۔۔۔ کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھکو
میری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے ۔۔۔ کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھکو
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جسکا اثر ۔۔۔ تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھکو

نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دینے کے بعد اقبال خسرو اور غالب کے مزارات پر بھی گئے۔ مزار غالب پر جاکر فاتحہ پڑھنا بھی معنویت رکھتا ہے۔ یہ گویا ایک تاجدار سخن کو دوسرے تاجدار سخن کا خراجِ عقیدت تھا۔

اقبال کو انگلستان جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال کیوں کر آیا؟ وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے انہیں اس طرف مائل کیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قانون سے دلچسپی بنیادی وجہ تھی۔ ۱۸۹۸ء میں ایم اے کی تعلیم کے دوران ہی انہوں نے قانون کا ابتدائی امتحان پاس کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد جون ۱۹۰۰ء میں انہوں نے متعلقہ محکمہ سے پھر امتحان دینے کی اجازت چاہی۔ جو نہ مل سکی۔ ۱۹۰۱ء میں سول سروس کے امتحان میں بیٹھے لیکن میڈیکل امتحان کے مرحلے سے نہ نکل سکے۔ اس زمانے میں قانون اور سول سروس ہی ایسے پیشے تھے جو ذہین اور باصلاحیت

نوجوانوں کے لیے کشش رکھتے تھے ان دونوں کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد بیرون ملک جا کر قسمت آزمائی کرنے کی خواہش فطری سی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے انہوں نے امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا تھا۔ کچھ معلومات بھی اکٹھی کیں لیکن بالآخر فیصلہ انگلستان جانے کا کیا۔ اس فیصلہ میں پروفیسر آرنلڈ کا ہاتھ یا اثر ہوگا۔ پروفیسر آرنلڈ سال بھر پہلے ۱۹۰۴ء میں لاہور کو خیرباد کہہ کر انگلستان جا چکے تھے۔ اقبال آرنلڈ سے بہت متاثر تھے۔

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

بہر حال وجہ خواہ کچھ ہو اقبال اپنی زندگی کے سب سے اہم سفر پہ دلی ہوتے ہوتے ۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے روانہ ہوئے۔ ۲۴ ستمبر کو لندن پہنچے اور ۲۵ ستمبر کو کیمبرج یونیورسٹی میں وارد ہوئے۔

کیمبرج پہنچ کر پہلا مسئلہ طعام و قیام کا تھا۔ اقبال کا اصرار تھا کہ وہ وہاں ٹھہریں گے جہاں ذبیحہ کا انتظام ہو تاکہ وہ اسلامی طریقے سے ذبح شدہ جانوروں کا گوشت استعمال کر سکیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے کوشش کر کے ایک معمر یہودی خاتون کے یہاں معقول معاوضے پر ان کے قیام کا انتظام کرا دیا۔ جہاں یہ شرط پوری ہو سکتی تھی یہاں رہتے ہوئے اُن کی عادت تھی کہ وہ رفع حاجت کے لیے لوٹا ساتھ لے جاتے تھے۔

مالکہ مکان کو تجسس ہوا۔ اس نے ایک روز ایسا کرنے کی وجہ معلوم کرنا چاہی۔ آپ نے اسلامی اصول طہارت کی وضاحت کی اور اس عمر رسیدہ خاتون کو بھی قائل کر لیا۔

اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی کے معروف کالج ٹرینٹی کالج میں داخلہ لیا۔ اگرچہ وہ پنجاب سے ایم اے کر چکے تھے لیکن وہاں کے قواعد و ضوابط کے مطابق انہیں دوبارہ بی اے کرنا پڑا۔ اس سے انہیں فائدہ بھی ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ تو خیر ان کے پرانے استاد تھے۔ فلسفہ کے نامور استاد پروفیسر میک ٹیگرٹ سے اقبال نے بہت کچھ سیکھا اور مشرقی علوم کے ملنے ہوئے ماہروں، پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے بھی رسم و راہ رہی۔ عربی و فارسی کی تحصیل و تحقیق کا ذوق و شوق جو چند سالوں سے انگریزی کے مقابلے میں کسی قدر دب گیا تھا۔ از سر نو تازہ ہو گیا۔ کیمبرج سے بی اے کرنے کے بعد اقبال لندن کے مشہور لا کالج، لنکن ان میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے (یہی کالج ہے جس میں قائد اعظم نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی) کیمبرج میں فلسفہ و تصوف کے ذوق کی تازگی کا ہی نتیجہ تھا کہ اقبال نے میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے جو موضوع منتخب کیا اس کا تعلق فلسفہ اور تصوف سے تھا۔ یعنی ایران کا فلسفہ مابعد الطبیعیات اس مقصد کے لیے جرمنی کی اس نامور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کی یہ شرط تھی کہ وہ تین سال تک یونیورسٹی میں رہیں۔ لیکچروں میں شامل ہوں اور مقالہ جرمنی زبان میں ہو۔ لیکن کیمبرج یونیورسٹی کے اساتذہ کی خصوصی سفارش پر اقبال کو ان شرائط سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ چنانچہ آپ نے اپنا تحقیقی کام انگلستان میں رہ کر انگریزی زبان میں شروع کیا۔ اس کی تکمیل کے لیے وہ ۲۵ ر اگست ۱۹۰۷ء کو میونخ پہنچے۔ میونخ میں پروفیسر ران کی غیر معمولی حسین اور ذہین بیٹی ان کی معلم اور اتالیق رہی۔ ۳۰ اگست کو وہ وہاں سے آکر جرمنی کے خاموش اور پرسکون علمی

شہر ہائیڈل برگ میں مقیم ہو گئے۔ جرمنی کے قیام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف تین مہینوں میں جرمن زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے زبانی انٹرویو جرمن ہی میں دیا۔ ۴۔ نومبر ۱۹۰۷ء کو میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے وہ لندن واپس آئے اور لنکن ان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ معاشیات اور سیاسیات کے مطالعہ کے لیے لندن اسکول آف اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈگری بھی لی۔

عطیہ فیضی سے ملاقات

قیام انگلستان اور جرمنی کے زمانے میں اقبال کی گوناگوں شخصیت کے کچھ اور گوشے سامنے آئے اور کچھ اور خوابیدہ صلاحیتیں بھی اُبھریں۔ کیمبرج پہنچتے ہی انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کے علمی و فکری حلقوں میں اقبال کی حاضر دماغی، قابلیت اور علمی فضیلت کا خاصا چرچا ہو گیا تھا۔ ذکر اقبال میں ہے کہ لندن کی ایک علم دوست سماجی خاتون مس بیک لندن میں ہندوستانی طلبہ کی امداد، دیکھ بھال اور خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں اور کبھی کبھار اپنے ہاں انکو کھانے کی دعوت دے کر باہم ملاقات اور تبادلہ خیالات کا موقع بھی دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں بمبئی کی ایک عالی خاندان، ذہین اور شائستہ خاتون عطیہ فیضی بھی انگلستان میں تحصیل علم کے لیے مقیم تھیں۔ مس بیک نے یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ بیگم کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا جس میں انہوں نے بتایا کہ آج آپ کی ملاقات ایک قابل آدمی محمد اقبال سے ہوگی جو کیمبرج سے محض آپ کی ملاقات

کے لیے یہاں وارد ہوا

عطیہ بیگم نے اس وقت تک اقبال کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ چونکہ مس بیک کی دعوت تھی اس لیے وہ پہنچ گئیں۔ کھانے کی میز پر اقبال سے ان کی ملاقات ہوئی عطیہ فیضی سے اقبال کی یہ اتفاقی ملاقات بھی ان کے قیام یورپ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ عطیہ بھی اپنے جمال و کمال میں جواب نہیں رکھتی تھیں۔ اِدھر اقبال بھی علم و فضل، ذہانت و فراست، میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اس پر شاعرانہ فکر و احساس مستزاد، دونوں نے ایک دوسرے کو شدت سے متاثر کیا اور یہ ملاقات ایک پائیدار اور خیال انگیز دوستی اور ذہنی رفاقت کی ابتداء بنی۔ اس کے بعد لندن، کیمرج اور جرمنی میں دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور ہندوستان واپس آنے پر بھی رسم و راہ رہی اور ایک عرصے تک مکاتیب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ عطیہ فیضی نے اپنی کتاب "اقبال" میں ان ملاقاتوں، جرمنی میں اقبال کی زندگی اور اقبال کے خطوط اور اپنے مشاہدات و تاثرات کا تذکرہ کیا ہے۔ عطیہ اس پہلی ملاقات کے بارے میں لکھتی ہیں:-

"میں نے دیکھا کہ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت میں کافی دخل رکھتے تھے حاضر جواب، ظرافت میں طاق اور طنز میں یکتا تھے۔ گفتگو میں کسی مخاطب کی ذرا سی کمزوری سے بھی فائدہ اٹھانا جانتے تھے اور حاضرین پر تابڑ توڑ چوٹیں کرتے چلے جاتے تھے۔ حافظ پر گفتگو شروع ہوئی تو انہوں نے اس شاعر کے کمالات کا اعتراف کیا بلکہ یہ کہا: جب میں حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں تو اس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت حافظ میں جذب ہو جاتی ہے گویا میں خود حافظ بن جاتا ہوں"۔ اس دن اقبال نے ایک اور فارسی شاعر کا ذکر بھی کیا۔ جس کو ہندوستان میں بہت کم لوگ جانتے

ہیں۔ مجھ سے کہا تم بابا فغانی کا کلام ضرور پڑھو کیونکہ زندگی کے متعلق ان کا تصور بہت مختلف اور دلچسپ ہے"۔ آگے چل کر لکھتی ہیں۔

چند روز بعد اقبال نے مجھے ایک ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی جس میں چند جرمن اسکالر بھی شامل ہوئے جن کے ساتھ اقبال ان دنوں ریسرچ کا کام کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس دعوت میں ہر چیز نہایت آراستہ پیراستہ' باقاعدہ اور دیدہ زیب ہے۔ میں نے اس حسن ترتیب کی داد دی تو اقبال نے کہا:

" میرے جسم میں بیک وقت دو شخصیتیں ہیں۔ بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کاروباری قسم کی ہے اور اندرونی شخصیت تصوّف اور تصور کا پیکر ہے"۔

عطیہ مزید لکھتی ہیں:

اس تقریب پر جرمن اسکالروں اور اقبال کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بے انتہا دلچسپ اور بے حد معلومات افزا تھی۔ اس کے جواب میں میں نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک دعوت چاء دی۔ جس میں اقبال کے علاوہ دوسرے ارباب علم وفن اور فلسفہ و لسانیات کی چند طالبات تھیں۔ اقبال بڑے شگفتہ موڈ میں تھے۔ وہ فی البدیہہ اشعار سُنا رہے تھے حسین طالبات چہک رہی تھیں۔ فقرے ہو رہے تھے۔ میں نے ارادہ کیا کہ اقبال کے اشعار لکھ لوں۔ اس پر اقبال نے کہا۔ اس قسم کے اشعار صرف وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں بس پڑھے گئے اور قصہ ختم ہوا۔ ان کو نقل کرنا بیکار ہے۔

۲۲ اپریل کو عطیہ بیگم، اقبال اور شیخ عبدالقادر لندن سے کیمبرج کو روانہ ہوئے اور سید علی بلگرامی کے یہاں پہنچے۔ جہاں اقبال نے عطیہ بیگم کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر بھی نہایت بلند پایہ مذاکرات ہوئے۔ عطیہ فیضی لکھتی ہیں:

کبھی کبھی اقبال ماندہ اور افسردہ معلوم ہوتے تھے اور بادی النظر میں محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ ایک حرف زباں سے نہ نکالیں گے۔ لیکن جہاں کسی ہم مجلس شخص کی زبان سے کوئی قابل گرفت فقرہ نکلا۔ اقبال کا جواب بجلی کی طرح کوند گیا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اقبال کی طبیعت کا خاصہ ہے جب وہ بظاہر تھکا ماندہ اور افسردہ ہو تو گویا کسی مدِ مقابل پر چوٹ کرنے کی تیاری میں مصروف ہوتا ہے"۔

یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک ہوئی۔ دریا کے کنارے ایک بڑے درخت کے سائے میں متعدد ذہین اور عالم لوگ جمع تھے۔ پروفیسر آرنلڈ باتیں کرتے کرتے موت وحیات کے مسئلہ پر بحث کرنے لگے۔ گوناگوں خیالات کے اظہار سے مباحثہ پیچیدہ سا ہو گیا۔ اقبال خاموش بیٹھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ ان سے کہنے لگے "آپ بھی تو کچھ کہیے"۔ اقبال نے چمک کر کہا "زندگی موت کی ابتدا ہے۔ اور موت زندگی کا آغاز"

پروفیسر آرنلڈ اقبال کی قابلیت اور صلاحیت کے اس درجہ معترف تھے کہ ۹ جون کو جب پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک ڈنر پر اقبال بھی مدعو تھے۔ فاضل پروفیسر نے کہا کہ جرمنی میں ایک نہایت نادر عربی مخطوطہ برآمد ہوا ہے جس کی تصحیح اور اقتباس کے لیے اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس اہم ذمہ داری کے لیے صرف یہی موزوں ہیں۔ اقبال نے گذارش کی کہ میں آپ کے مقابلہ میں بالکل طفل مکتب ہوں۔ میں جرأت نہیں کر سکتا۔ پروفیسر آرنلڈ نے کہا: نہیں اس معاملہ میں شاگرد استاد سے بہت بہتر ثابت ہو گا۔ اقبال نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے عرض کیا۔ جناب والا۔ اپنے استاد کی رائے کو تسلیم کرتا ہوں اور ان کے احکام کی تعمیل کر دوں گا"

۲۳ جون ۱۹۰۷ء کو عطیہ بیگم کے مکان پر چند مقتدر انگریز اور ہندوستانی جمع ہوئے اقبال نے تمام شرکاء محفل کے متعلق ایسے برجستہ اشعار سنائے کہ سننے والے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

۲۷ جون کو ایک جرمن خاتون مس شولی نے دوستوں کو ہندوستانی کھانے کی دعوت دی۔ عطیہ لکھتی ہیں کہ میں وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ اقبال وہیں مقیم ہیں اور ہندوستانی کھانے تیار کرنے میں مس شولی کو نہایت ماہرانہ مشورے دے رہے ہیں۔ یہ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ یہاں سے سب لوگ امپیریل انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ تقریب میں چلے گئے جہاں بڑی رونق تھی اس لیے کہ وہاں شاہی خاندان کے افراد بھی موجود تھے۔ سب حاضرین دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے لیکن اقبال بار بار کہہ رہے تھے کہ یہ ایک دلچسپ تضیع اوقات ہے"۔

۲۹ جون کو ایک معزز انگریزی خاتون نے ایک پارٹی دی۔ جس میں اقبال بھی موجود تھے۔ دفعتاً ایک ممتاز ہندو خاندان کی ایک خاتون بڑے بھڑکیلے کپڑے اور بدمذاقی سے زیورات لادے۔ وہاں آن دھمکیں اور اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "میں تو صرف آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں"۔ اقبال کی ظرافت کا شعلہ چمکا۔ انھوں نے فوراً کہا:

"یہ صدمہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ میں اس سے جانبر ہو سکوں گا"

عطیہ بیگم مزید لکھتی ہیں کہ جولائی ۱۹۰۷ء کے آغاز تک اقبال جرمن زبان کے امتحان کے سلسلے میں تاریخ عالم لکھ چکے تھے۔ اس کے بعد چند روز میں اقبال نے اپنے مقالات احباب کو سنائے اور جولائی کے تیسرے ہفتے میں جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں اقبال کا

زیادہ وقت ہائیڈل برگ میں صرف ہوا تھا۔ کیونکہ اس یونیورسٹی میں ان کے مقالے کے متعلق تحقیق و تدقیق کی سہولتیں زیادہ تھیں۔ دوسرے یہاں کا ماحول زیادہ علمی اور سنجیدہ تھا۔ اقبال نے بھی اپنی لندنی شوخی، طراری، طنازی چھوڑ کے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ہائیڈل برگ میں اتفاق سے ان کی فلسفے کی پروفیسر دو ایسی جرمن خواتین تھیں جو جوان اور نہایت حسین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مضمون میں ماہرانہ نظر رکھتی تھیں۔ ان کے نام تھے۔ فراؤ پروفیسر واژناسٹ، اور فراؤ پروفیسر سینے شال یہی انہیں فلسفے کے دقیق پہلوؤں پر درس دیتی تھیں۔ یونیورسٹی کے تدریسی معمولات کے علاوہ ہر طالب علم کشتی رانی، موسیقی، باغبانی اور کوہ پیمائی وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کر لیتا تھا اور کبھی کبھی اقبال بھی ان مشغلوں میں شامل ہو جایا کرتے۔ دن بھر کی رسمی تعلیم کے بعد طلبہ اور پروفیسر پاس ہی ایک دریا کے کنارے کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے اور وہاں دونوں خاتون پروفیسریں جرمن، یونانی اور فرانسیسی فلسفے پر طلبہ سے مذاکرہ شروع کر دیتیں۔ اقبال ان کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوتے اور ایک ایک لفظ غور سے سنتے۔ خصوصاً وہ فراؤ سینے شال کی معلومات علمی سے بہت مرعوب تھے اور جب کبھی وہ اقبال کے کسی غلط جواب پر انہیں ٹوکتیں تو اقبال سکول کے ایک بچے کی طرح شرمندہ ہوتے۔

۲۲ر اگست کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ طلبہ اور پروفیسروں نے ایک پکنک کا انتظام کیا اور ہر شخص کو اس کی قیام گاہ سے ساتھ لیتے گئے۔ اقبال کا مسکن اس راستے پر آخر میں تھا۔ وہاں سب لوگ پہنچے تو اقبال پکنک پر جانے کے لیے تیار ہونے کے بجائے ایک عالم مدہوشی میں خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ پچھلی رات ہی

سے اس عالم میں ہیں۔ سامنے ایک کتاب رکھی ہے اور بالکل پتھر کے بت کی طرح اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر بیٹھے خلا میں گھور رہے ہیں۔ طلبہ یہ دیکھ کر بے حد حیران ہوتے۔ دونوں خاتون پروفیسروں کی تشویش تو لاانتہا تھی۔ طرح طرح کے اندیشوں کی وجہ سے کوئی اقبال کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ آخر عطیہ بیگم نے جرأت کی اور اقبال کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا جس پر وہ کسی قدر ہوش میں آئے کچھ دیر کے بعد تیار ہو کر پکنک میں شریک ہوئے اس سفر میں سب نے مل کر ایک ہندوستانی گانا۔ گھرا بچپن والی نادان یہ تیرا نخرا بھی بڑے مزے سے گایا۔ سب گاتے جاتے تھے اور ہار بنانے کے لیے جنگلی پھولوں کو توڑتے جاتے تھے۔ یکایک پارٹی رک گئی اور تفریح و تفنن کے طور پر وہ ہار اقبال کے سر کے گرد یہ کہہ کر لپیٹ دیے گئے کہ ہم آپ کو نامعلوم دنیا کی بادشاہت کا تاج پہناتے ہیں۔

۲۲ راگست طلبہ اور معلموں کا یہ قافلہ تعلیمی تفریح کے لیے پھر نکلا۔ اقبال ایک تاریخی مقام پر جا کر بیٹھ گئے اور اردو میں مزاحیہ اشعار سناتے رہے جب جرمن طلبہ نے پوچھا کہ ان اشعار کا مطلب کیا ہے تو اقبال نے کہا: ”نادیدہ خدا کی طرف سے مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کو آسمانی زبان میں حکم دوں کہ آپ ایک میجک سرکل بنائیں اور پھر فرشتوں کا نغمہ سنائیں“۔ اس حکم کی فوری تعمیل کی گئی۔

۲۵ راگست کا دن باغ فردوس کی سیر کے لیے مقرر کیا گیا جس میں کسی بادشاہ نے تمام مذاہب کی عبادت گاہیں جن میں ایک مسجد بھی تھی تعمیر کی تھیں۔ جس عمارت کو مسجد بتایا جاتا تھا وہ بہت دلکش تھی۔ اس پہ ہر جگہ لفظ اللہ عربی میں کندہ تھا۔ اس کے علاوہ مختلف سورتوں کی کچھ آیات بھی کندہ تھیں۔ ہر شخص یہ جاننے کا خواہش مند تھا

کہ اس تحریر کا مطلب کیا ہے۔ اس پر اقبال نے نہایت سنجیدگی سے عربی کتبوں کو پڑھا اور انہیں بتایا کہ کتبوں میں اس جگہ کی تاریخ کندہ ہے۔ اقبال نے کہا جس بادشاہ نے یہ جگہ تعمیر کی تھی۔ اسے اتفاق سے ایک حور مل گئی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے حور نے کہا میں آپ کی ملکہ بننے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ایک مسجد تعمیر کریں جہاں ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔ بادشاہ نے شرط منظور کر لی۔ مسجد تعمیر کرائی اور مسلمان ہوا۔ اور یہیں اس کا نکاح پڑھایا گیا۔ اقبال نے یہ من گھڑت کہانی کچھ اس سنجیدگی سے سنائی کہ کہانی کا لطف دوبالا ہو گیا۔

۲۸ اگست ۱۹۰۷ء کا دن میونک میں بسر ہوا۔ جرمنی کے تمام شہروں میں اقبال میونک ہی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور اس کی وجہ بقول عطیہ فیضی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ابتدائی اسباق وہیں پروفیسر رین کی حسین اور ذہین صاحبزادی کے زیر ہدایت لیے تھے۔ اقبال میونک کو جزیرۂ مسرت کے نام سے یاد کرتے تھے جیسے تخیل کے سمندر میں نہلایا گیا ہو۔ میونک کے قابل دید مقامات دیکھنے کے بعد سب لوگ پروفیسر رین کے گھر گئے اور چند رسمی باتوں کے بعد نوجوان اور حسین و جمیل فراؤلائن نے اقبال کا امتحان لینا شروع کر دیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میونک چھوڑنے کے بعد انہوں نے فلسفہ میں کتنی ترقی کی ہے وہ عورت علم کا بحر بیکراں تھی اور شفقت کا پیکر بھی۔ وہ اقبال کی غلطیوں پر نہایت نرمی سے تنبیہہ کرتی تھی۔ عطیہ بیگم لکھتی ہیں کہ میری حیرانی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ہم نے دیکھا کہ فلسفہ کی وہ حسین نوجوان پروفیسر پیانو کے پاس گئی اور نہایت کمال فن کے ساتھ کلاسیکل موسیقی کا مظاہرہ کیا اور اقبال سے پوچھا کہ بتاؤ میں کیا گا رہی ہوں۔" اقبال پہلے اس کے علم سے مرعوب ہوئے تھے اب اس کے کمال فن سے مسحور ہو گئے تھے

اس کے جمال و کمال نے انہیں بالکل بیخود کر دیا تھا۔ فرالائن رین علم کی ہر شاخ میں ید طولیٰ رکھتی تھی اور خود بھی قدرت کا ایک شاہکار تھی۔ اقبال نے اسی یکتائے روزگار دوشیزہ کے زیر ہدایت وہ علمی مقالہ تیار کیا تھا جس پر انہیں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی سند ملی اور یہ اقبال کی عجیب خوش نصیبی تھی کہ حصول تعلیم کی ہر منزل میں انہیں جو استاد ملا۔ وہ اپنے فن میں اور اپنے دائرے میں یکتا تھا۔ آخر میں جرمنی میں فلسفہ کی تحصیل کے سلسلہ میں جن تین جرمن پروفیسروں سے انکا واسطہ پڑا وہ بھی حسن صورت میں، جمال سیرت میں اور کمال علم و فن میں یکتائے روزگار تھیں)

۳۰ اگست کو اقبال ہائیڈل برگ واپس آگئے۔ اقبال نے کشتی رانی کی دوڑ میں عطیہ فیضی کے ساتھ حصہ لیا اور سب سے پیچھے رہ کر اپنا امتیاز قائم رکھا۔ ۳۱ اگست کو وادی دریائے نیکر میں پکنک کے دوران پھولوں کے تاج پہن کر سب نے رقص کیا۔ اقبال سے فرمائش ہوئی کہ وہ اپنے ملک کا دیہاتی رقص کریں۔ فرا پروفیسر ویگے ناست نے ان کا ساتھ دیا۔ ناچ میں دوسرے طلبہ بھی شامل ہو گئے۔ اقبال اس فن میں بہت کچے تھے اس لیے ان کے ناچ کو دیکھ کر بہت ہنسی اڑی۔

اقبال کے ہائیڈل برگ کے آخری چند ایام کا ایک اور واقعہ بھی عطیہ بیگم نے اپنی کتاب "اقبال" میں لکھا ہے جس کو نقل کرنا اقبال کے جرمنی کے ذہنی اور جذباتی تجربات کی تصویر کو مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے وہ لکھتی ہیں:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فرالائن ویگے ناست، فرالائن سینے شل اور فرالائن کیدر نات ورزش گاہ میں جسمانی کلچر کی ورزشوں میں مصروف تھیں اور فرالائن ویگے ناست کے بازو ورزش کی ضرورت کے تحت مجھے اپنے حلقہ میں لیے ہوتے تھے۔ ہم ان مشقوں میں اسی طرح

معروف تھیں کہ اتنے میں اقبال آ گئے اور ہمیں گھورنے لگے اور پھر بت کی طرح ساکت کھڑے ہو گئے۔ جب فراالائن پروفیسر ویگے ناست نے پوچھا کہ وہ اس طرح سے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ میں یکایک ہیئت دان بن گیا ہوں اس لیے میں ستاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد عطیہ بیگم لکھتی ہیں:

اسی شام کو رات کے کھانے پر ہمارے یہاں ایک خاتون مہمان آئیں جن کے بال بہت خوبصورت اور سنہری تھے اور چونکہ وہ بہت نوعمر تھیں اس لیے ان کے رخساروں پر نرم نرم سنہری روئیں زیادہ نمایاں تھے۔ اقبال نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اُردو کا یہ شعر پڑھا:

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں
ہو طلائی استرا اس کے لیے

عطیہ بیگم کے ان بیانات سے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کے بعض ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو اس سے پہلے مخفی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی کے مختصر قیام نے ان کے دل و دماغ پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔

جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر اقبال واپس لندن آ گئے۔ ان دنوں پروفیسر آرنلڈ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے چھ مہینے کی رخصت لی تو اقبال ان کی جگہ عربی کے پروفیسر مقرر کر دیئے گئے۔

مئی ۱۹۰۸ء میں لندن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ سید امیر علی اس کمیٹی کے صدر تھے اور اقبال مجلس عاملہ کے رکن چُنے گئے۔ ملکی و قومی سیاست سے اقبال کا یہ پہلا عملی تعلق تھا۔

یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو انہوں نے لنکنز ان سے بیرسٹری کی سند لی اور اس طرح انگلستان

میں تعلیمی مشاغل سے کماحقہٗ فارغ ہو کر اقبال واپس وطن روانہ ہوتے اور ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو لاہور پہنچے۔ باغ بیرون بھاٹی دروازہ میں شیخ گلاب دین نے اقبال کے اعزاز میں پارٹی دی۔

ستمبر ۱۹۰۵ء سے جولائی ۱۹۰۸ء تک تقریباً تین برس اقبال نے انگلستان اور جرمنی کے بہترین علمی اداروں میں بہترین ذہنوں کے درمیان گزارے۔ اس عرصے کے دوران گوناگوں علمی، ذہنی اور جذباتی تجربوں نے ان کی دنیا بدل دی، دماغ کی بھی، دل کی بھی، جب وہ گئے تھے تو کچھ تو ابتدائی تربیت اور کچھ خاندانی روایت کی وجہ سے وہ روایتی تصوف سے دلچسپی رکھتے تھے۔ فلسفہ اور تصوف کے گہرے مطالعے سے ان پر انکشاف ہوا کہ روایتی تصوف تو اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شعر گوئی میں وہ بڑی حد تک مشرقی اسلوب اظہار سے مانوس تھے۔ انگلستان میں انہیں مغربی اسالیب شعر سے براہ راست مستفید ہونے کا موقعہ ملا تو انہوں نے مغربی شعرا کے انداز میں بھی کچھ نظمیں لکھیں۔ فن شعر کے بارے میں وہ الجھن میں پڑ گئے۔ ذہنی گو مگو کے اس زمانے میں انہوں نے ایک دفعہ تو ترک شعر کا ارادہ بھی کر لیا اور اپنے احباب سے بھی کہہ دیا کہ اب میں شعر نہیں کہوں گا۔ شیخ عبدالقادر ان دنوں انگلستان میں ہی تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا انداز فکر اساسی طور پر مشرقی ہے اور آپ کی شاعری ملک و قوم کے لیے بے حد مفید ہو سکتی ہے۔ اس لیے ترک شعر کا ارادہ مناسب نہیں بہت بحث مباحثہ کے بعد دونوں دوست پروفیسر آرنلڈ کے پاس گئے۔ اور ان سے اس معاملے میں مشورے کے طالب ہوتے۔ آرنلڈ اپنے نوجوان شاگرد کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انہوں نے اقبال کو اس ارادے سے روکا اور کہا کہ آپ کو ضرور شعر کہتے رہنا چاہیے اور اس مشغلہ کو چھوڑ دینا ظلم ہو گا۔ چنانچہ اقبال نے اپنا فیصلہ منسوخ کر کے استاد

کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

شاعری انہوں نے ترک تو نہیں کی لیکن اس تمام عرصے میں بہت کم کہا۔ بانگ درا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں انہوں نے چھوٹی بڑی کل چوبیس نظمیں اور چند غزلیں کہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں تجسس و تفکر نے بعض الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ کچھ جذباتی اضطراب ہے۔ ذہن میں کچھ سوال اُبھر رہے ہیں جن کا جواب حسن و عشق کی وادی میں بھی نہیں ملتا۔ محبت، حقیقت حسن، حسن و عشق، وصال، سلیمی وغیرہ خالص حسن انسانی اور جذبات عشق پر مبنی نظمیں ہیں۔ اختر صبح، چاند تارے، ایک شام، حسن فطرت سے متعلق ہیں۔ لیکن بعض نظموں میں انسان کی بیچارگی اور تحیّر کا احساس واضح ہے۔ مثلاً انسان، فراق، لیکن سب سے زیادہ تغیر یہ نظر آتا ہے کہ وطن پرستی اور متحدہ قوم پرستی کے وہ جذبات و خیالات جو یورپ جانے سے پہلے شاعر کے دل و دماغ پر حاوی تھے۔ ان کی گرفت بڑی حد تک نرم پڑ گئی ہے۔

قیام انگلستان کے دوران اقبال کی فکر میں بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں کیونکہ مغرب کی جن قوموں نے اس اصول زندگی کو اختیار کیا ہے۔ نہایت درجہ کی خود غرض ہو گئی ہیں۔ ملک گیری و استحصال کی خواہش نے ان کو بلند اخلاقِ انسانی سے محروم کر دیا ہے اگر قوم پرستی اس غرض پرستی اور ظالمانہ استحصال کا نام ہے تو یہ کسی غیور قوم کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں جب اقبال نے دنیائے اسلام کے جمود، مسلمانوں کی بے عملی اور تعلیمات اسلام کی کسمپرسی کو دیکھا تو انہوں نے اپنے ابتدائی خیالات سے رجوع کر کے اپنا مسلک یہ قرار دیا کہ ملتِ اسلامیہ کو بیدار کیا جائے اور اس کو اقدار و اخلاقِ اسلامی سے از سرِ نو آشنا کیا جائے۔ اس

احساس کالازمی نتیجہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے لیے اخلاق عالیہ کی بنیاد تلاش کرتے۔ چونکہ انہوں نے بزرگانِ دین کے زیرِ نظر پرورش پائی تھی اور دینِ اسلام کے معارف و حقائق ان پر آئینہ تھے۔ اس لیے انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمان کے پاس آبرومندانہ زندگی گزارنے کے لیے نہایت سنگین و مستحکم بنیاد موجود ہے جس پر تہذیب، ترقی اور سربلندی کا قصر تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اس دور کی نظموں میں علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام اور عبدالقادر کے نام جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمتِ ملت کا جذبہ اقبال کے قلب میں موجزن تھا "عقلیہ" میں جو درد و سوز کی کیفیت ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس کی عظیم الشان تاریخ یاد دلا کر بیدار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ اب ہمالہ، نیا شوالہ، میرا وطن وہی ہے، کا دور گزر چکا تھا۔ اقبال نے ایک نئی منزل کا تعین کر لیا تھا۔

ایک موقع پر قیام یورپ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اقبال نے کہا "یورپ نے مجھے مسلمان کر دیا"۔ مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کی مجلس عاملہ کی رکنیت کے علاوہ کیمبرج یونیورسٹی میں اسلام اور اسلامی فلسفے پر نصف درجن مقالات لکھے۔ پین اسلامک سوسائٹی کی تنظیم میں حصہ لیا۔ سید امیر علی، سید علی بلگرامی جیسی اہم شخصیتوں سے ذاتی مراسم پیدا کیے۔ لندن میں اسلام پر کئی لیکچر دیئے۔ پہلا لیکچر لندن کے کیکسٹن ہال میں ہوا۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ لکھنے کے دوران عجمی تصوف کا تحقیقی مطالعہ کیا جس سے نظریہ وحدت الوجود کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وطنیت کا جو سیاسی تصور یورپ میں مقبول تھا اس کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ وطنیت خود ایک بت ہے اسے توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور ایک وسیع تر اسلامی مملکت کے قیام اور تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے اس تصور کو جڑ سے اکھاڑنا ضروری ہے۔

انگلستان کے قیام ہی کے دوران انہوں نے فارسی کو ذریعہ اظہار بنانے کا فیصلہ کیا اور بعد کو زیادہ تر فارسی میں کہا۔

یورپ سے واپسی

یورپ سے واپسی پر اقبال پھر دلی ٹھہرے۔ خواجہ نظام الدین اولیا، محبوب الٰہی، امیر خسرو اور مرزا غالب کے مزارات پر دوبارہ حاضری دی۔ (ایسا کرنا ان کے ذہنی رجحانات کی غمازی کرتا ہے) اور انبالہ میں اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے دوپہر کی گاڑی سے لاہور پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر احباب اور مداحین نے پرجوش اور پرخلوص انداز سے استقبال کیا۔ اسٹیشن سے وہ دوستوں اور احباب کے ساتھ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں بھاٹی دروازہ گئے۔ جہاں ان کے اعزاز میں عصرانہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر وہ اسی شام سیالکوٹ روانہ ہو گئے جہاں ان کے والدین اور اعزا ان کے لیے چشم براہ تھے۔

چند دنوں کے بعد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے لاہور آئے اور اقبال کے دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر کے مشورے سے ضلع کچہری کے قریب موہن لال روڈ (اُردو بازار) پر اقبال کے لیے ایک مکان کرائے پر لیا گیا۔ قانون کی کتابیں مہیا کی گئیں اور اس کی بیٹھک میں اقبال کی وکالت کے لیے دفتر جما دیا گیا اور منشی طاہر الدین ان کے منشی مقرر ہوئے (ان منشی طاہر الدین نے تاحیات ان کی خدمت کی اور اس حد تک ان کے معتمد ٹھہرے کہ برسوں بعد اقبال نے اپنی وصیت میں انہیں اپنے بچوں کا ایک ولی مقرر کیا) چونکہ اقبال نے ضلعی عدالتوں میں وکالت کرنا پسند نہیں کیا۔ اس لیے موہن لال روڈ

کے اس مکان میں وہ صرف چند مہینے رہے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اقبال نے چیف کورٹ میں درخواست دی کہ میرا نام وکلا کی فہرست میں درج کر لیا جائے اور مجھے ایڈووکیٹ چیف کورٹ قرار دیا جائے۔ چنانچہ درخواست منظور ہونے کے بعد اقبال چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ اسی اثنا میں وہ موہن لال روڈ کے مکان کو چھوڑ کر انار کلی کے ایک مکان کی اوپر کی منزل پر منتقل ہو گئے۔ اس مکان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مشہور وکیل سر محمد شفیع رہ چکے تھے۔ اس لیے یہ خاصا مشہور تھا۔ دوسرے یہ چیف کورٹ سے قریب تر تھا۔ اسی میں علامہ کی سکونت تھی۔ اسی میں دفتر تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں ان کے منشی طاہرالدین بھی رہتے تھے۔ اس گھر میں علامہ سیدھے سادے طریقے سے ۱۹۲۲ء تک رہے۔ یہیں ان کی شہرت و عظمت کو چار چاند لگے۔

وکالت شروع کرنے کے کچھ دنوں بعد انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی پروفیسری پیش کی گئی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے ان کے قانونی مشاغل میں خلل پڑے گا۔ اس لیے وہ اس پیش کش کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن کالج کے پرنسپل مسٹر رالبسن کے بے حد اصرار پر انہوں نے جز وقتی ملازمت قبول کر لی۔ مسٹر رالبسن کی تحریک پر محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام نے چیف کورٹ کو لکھا کہ ڈاکٹر اقبال کے مقدمات ہمیشہ ان کی کالج کی تدریسی مصروفیات کے بعد سنے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اقبال صبح سویرے گورنمنٹ کالج جاتے اور نو بجے وہاں سے فارغ ہو کر چیف کورٹ میں وکالت۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سال تک گورنمنٹ کالج میں ایم اے کی کلاسوں کو فلسفہ اور بی اے کو انگریزی پڑھاتے رہے پہلے ایڈیشنل پروفیسر مقرر ہوتے تھے۔ پھر اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔

گورنمنٹ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں ایک دفعہ لڑکوں کی حاضری کے معاملہ

میں پرنسپل سے اختلاف رائے ہو گیا۔ انگریز پرنسپل کا انداز گفتگو انہیں بہت ناگوار گزرا۔ چنانچہ اسی دن سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اقبال گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر آتے تو ان کے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ میں نے پوچھا: "شیخ صاحب! آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی" کہنے لگے "علی بخش انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں عام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ مگر انگریز کا نوکر رہ کر انہیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں۔ جو چاہوں کروں شاید یہ پھانس جو مدت سے میرے دل میں کھٹکتی رہی اب نکل جائے"

جذباتی اضطراب کا دور

اس کے بعد آپ نے کئی اعلیٰ ملازمتیں ٹھکرا دیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی آپ کو پروفیسری کی پیش کش کی اس کے علاوہ گورنمنٹ کالج میں بھی تاریخ کی پروفیسری پیش ہوئی۔ اقبال نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ اس انکار کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ وکالت کے پیشے میں جمنے لگے تھے یا اس پیشے سے انہیں کوئی خصوصی دلچسپی تھی۔ گو بظاہر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ اقبال بیرسٹری میں مگن ہیں۔ انہوں نے ایک چھوٹی بگھی خرید لی تھی۔ ایک پوربیا ملازم نوکر تھا۔ بڑے اہتمام سے عدالت میں جاتے تھے۔ وکیلوں کے کمرے (بار روم) میں ان کی ظرافت کے پھول کھلتے اور طنز کے تیر چلتے رہتے تھے۔ مرزا جلال الدین بیرسٹر، نواب سر ذوالفقار علی، سر جگندر سنگھ اور سردار امراؤ سنگھ ایسے دوستوں سے ان کے قریبی مراسم تھے ان کے ساتھ دن رات کی محفلیں جمتی تھیں، رقص و سرود سے لطف اندوز ہوتے تھے ستار کا بہت شوق تھا۔ خود بھی ستار سے شغل کرتے تھے۔ بازار حکیماں کے عمائدین اور شہر کے

فضلاء اور خوش ذوق حضرات سے صحبتیں رہتی تھیں۔ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان دونوں اداروں کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے عہدیدار بھی تھے۔ ان تمام دلچسپیوں اور مشاغل کے باوجود یورپ سے آنے کے بعد کے یہ چند سال اقبال کی زندگی کے انتہائی پر اضطراب سال تھے۔ انہیں ذہنی اور جذباتی سکون بالکل میسر نہیں تھا۔ یورپ کے تجربے نے انہیں ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ذہنی طور پر بھی اور جذباتی طور پر بھی۔ ذہنی طور پر وہ تخلیق کے کرب سے دوچار تھے۔ وطن پرستی اور متحدہ قومیت کے تنگ تصورات کو مسترد کر کے وہ نئی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اسلامی نظریہ قومیت اور نظریہ خودی ان کے تحت الشعور میں نشوونما پا رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ان کی جذباتی زندگی میں بھی طوفان آیا ہوا تھا۔ یورپ میں انہیں جن غیر معمولی حسین اور ذہین، باجمال و باکمال خواتین سے واسطہ پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعرانہ طبیعت نے ان سے خاصا اثر قبول کیا تھا۔ پھر بدقسمتی سے اس زمانے میں ان کی ازدواجی زندگی تلخیوں کا شکار ہو کے رہ گئی تھی۔ بیوی سے بالکل نباہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شدید جذباتی کشمکش اور بے چینی کا دور تھا۔ اس اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی متاثر ہو رہی تھیں۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں انہوں نے بہت کم لکھا۔ شاعری تو تقریباً ترک تھی۔ اس دور کی بیشتر یادگار وہ اشارات اور تاثرات ہیں جو وہ اپنی ذاتی ڈائری میں (انگریزی میں) افکار پریشاں (اسٹرے تھاٹس) کے عنوان سے کبھی کبھی لکھ ڈالا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اقبال کے ذہن کی صحیح عکاسی ان خطوط سے ہوتی ہے۔ جو انہوں نے اس زمانے میں اپنی جرمنی اور انگلستان کی رفیق سفر اور ہم فکر دوست عطیہ فیضی کو لکھے (جن کا شمار اس دور کی نہایت ہی باجمال، باکمال اور ممتاز خواتین میں ہوتا تھا)۔ ۹ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں:-

"ہاں! میں نے علی گڑھ کی فلسفہ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور چند دن ہوئے میں نے لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی پروفیسری کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ میں کسی قسم کی ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں۔ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔ میری زندگی سخت مصیبت بنی ہوئی ہے وہ مجھ پر کوئی سی بھی بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بالخصوص جب کہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کی کفالت کرنے پر بالکل رضامند ہوں لیکن میں اُسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت اور خوشی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اگر سوسائٹی مجھے وہ حق دینے سے انکار کرے تو میں دونوں کا کھلم کھلا مقابلہ کروں گا۔ واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے یہ مردہ بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے میری روح میں کافی آگ پنہاں ہے جو انہیں جلا سکتی ہے اور تمام سماجی رسوم کو بھی آپ کہیں گی کہ ایک اچھے خدا نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر اس زندگی کے واقعات ایک مختلف نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ کسی اچھے خدا کی بجائے ذہنی طور پر کسی قادر مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے۔ براہ کرم ان خیالات کے اظہار کے لیے معاف کیجئے گا۔ میں ہمدردی کا خواستگار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اپنی روح کے بوجھ کو اتار دینا چاہتا تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو الفاظ

کا جامہ پہنانے کی جرأت کی ہے۔"

اس خط کے بعد، ۷ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں اقبال نے عطیہ فیضی کو لکھا:۔

آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتا اور میرا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ گزشتہ رات میں بہشت میں پہنچا اور دوزخ کے دروازوں میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا میں نے اس جگہ کو خوفناک طریقے سے سرد پایا جب فرشتوں نے مجھے متعجب پایا تو انہوں نے کہا کہ یہ جگہ اپنی فطرت کے اعتبار سے سرد ہے۔ لیکن وہ شدت سے گرم ہو جاتی ہے اس لیے کہ ہر ایک شخص اپنے انگار اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس ملک میں جہاں کوئلے کی کانیں بہت زیادہ نہیں ہیں جتنے انگارے جمع کرنے ممکن ہیں ان کے جمع کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ آج کل میں دوسروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا میری اپنی بدنصیب ذات مصیبت انگیز خیالات کی کھان بنی ہوئی ہے جو سانپ کی طرح میری روح کے عمیق اور تاریک سوراخوں سے باہر نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں پیبرا بن جاؤں گا۔ اور بازاروں میں گھومتا پھروں گا۔ اس طرح سے کہ متجسس لڑکوں کی ایک جماعت میرے پیچھے ہوگی۔"

عطیہ فیضی کے نام اقبال کے ان خطوط سے (جو خود عطیہ فیضی نے اپنی کتاب "اقبال" میں شائع کیے ہیں) اقبال کی شخصیت کے ایک اہم رُخ سے پردہ اٹھتا ہے۔ انتہائی راز داری سے لکھے ہوئے ان ذاتی خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال ان دنوں کس شدید ذہنی اور جذباتی کرب میں مبتلا تھے اور کتنے تنہا تھے۔ شاید عطیہ کے سوا کوئی ان کا راز دان نہ تھا۔ مایوسی اور اضطراب میں وہ اکیلے جل رہے تھے لیکن ان کے دماغ نے شکست قبول نہیں کی تھی۔ ذہن کا فلسفیانہ [illegible] ہو رہا تھا۔ اور فکر کا اسلامی رخ متعین ہو رہا تھا۔ مارچ

۱۹۱۰ء میں جب وہ حیدر آباد دکن کے پہلے دورے پر گئے تو انہوں نے اورنگ آباد میں اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر حاضری دی اور ولولہ انگیز نظم (گورستان شاہی لکھی) اسی سال جولائی میں وہ انجمن حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داخلی انتشار کے باوجود وہ اپنے سماجی اور ملی فرائض سے غافل نہیں تھے اور اس سمت میں ان کا ذہنی سفر جاری تھا۔ اپریل ۱۹۱۱ء کے انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم شکوہ پڑھی (اس اجلاس میں ان کے والد ماجد شیخ نور محمد بھی موجود تھے۔ روایت ہے وہ سنتے جاتے تھے اور فخر و شکر کے آنسو ان کی آنکھوں سے بہتے جاتے تھے) 'شکوہ' ان کی پہلی بھرپور ملی اور سیاسی نظم ہے۔ اسی زمانے میں وہ خودی کے فلسفہ کی گتھیاں بھی سلجھا رہے تھے اور اپنے والد کے ارشاد کی تعمیل میں فارسی میں ایک مثنوی لکھنے کی تیاری میں بھی مصروف تھے۔ جولائی ۱۹۱۱ء کے خط میں انہوں نے عطیہ فیضی کو اس مجوزہ مثنوی کے ابتدائی اشعار بھی لکھ کر بھیجے۔ ان کے گھریلو حالات اب بھی تکلیف دہ تھے۔ لیکن انہوں نے ان کے ساتھ گزارا کرنا سیکھ لیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۱ء کے اسی خط میں لکھتے ہیں: "میں ان دنوں بہت ہی پریشان رہا ہوں میری بدقسمتی ایک وفادار کتے کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں نے اس خاتون کو پسند کرنا سیکھ لیا ہے بہ سبب اس کی نہ تھکنے والی وفاداری کے جو اسے اپنے بدنصیب اور ناشاد آقا سے تھی"۔

اس دل شکستگی کے باوجود اقبال اپنی تخلیقی اور قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے تھے۔ ۱۹۱۱ء کے اواخر میں انہوں نے دہلی میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔ فروری ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اپنی مشہور نظم شمع و شاعر لکھی جو اسی سال اپریل میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی۔ 'شمع و شاعر'

اقبال کی زندگی اور شاعری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں واضح طور پر ملتِ اسلامیہ کے لیے ایک اُمید پرور پیام ہے اضطراب اور مایوسی کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار اسی نظم کے ہیں۔

- وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
- فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
- وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
- بیخبر! تو جوہرِ آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!
- آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
- شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے! یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

ان اشعار میں جو قطعیت ہے جو دھوپ، اور روشنی ہے جو سمت کا احساس ہے وہ اس توازن و اعتدال کا غماز ہے جو اقبال کی زندگی میں پیدا ہو رہا تھا۔ بالآخر انھوں نے اپنے اندرونی اضطراب و انتشار پر قابو پا لیا اور اُن کے اندر کا خود آگاہ و خُدامست درویش، شاعر کی جذباتی شوریدگی اور فنکار کی جنون سامانی پر غالب آگیا۔ اِس کا اظہار ان کے رہن سہن اور سماجی زندگی پر بھی ہوا۔ یورپ سے آنے کے بعد انھوں نے لباس اور معاشرتی دنیاداری کا جو تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ رکھا ہوا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ ۱۹۱۲ء ہی میں "مسلم"، "حضور رسالتمآب میں"، اور "فاطمہ بنت عبداللہ"، ایسی نظمیں لکھی گئیں۔ اپنی ذاتی زندگی کے آلام پر قابو پانے کے بعد اقبال مسلمانوں کی قومی اور سیاسی زندگی میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ شاعری کے ذریعے بھی اور عملاً بھی۔ ۱۹۱۳ء میں اقبال نے کانپور کی مسجد کی شہادت کے سلسلے میں مشہور مذہبی رہنما خواجہ حسن نظامی کے ساتھ

کانپور کے کلکٹر سے ملاقات کی۔ انہی دنوں وہ آلہ آباد گئے اور مشہور شاعر اکبر الہ آبادی سے ملاقات کی۔ دلّی میں ممتاز سیاسی رہنما حکیم اجمل خان سے ملے۔ اسی سال باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک بڑے جلسہ میں اقبال نے اپنی نظم جواب شکوہ پڑھی۔ اقبال اپنی نظم ترنم سے سناتے تھے۔ نہایت ولولہ اور جوش کے ساتھ، آواز میں سوز تھا۔ ہزاروں کے مجمع میں جب ان کی آواز گونجتی ہوئی بلند ہوتی تھی تو سننے والوں پر جادو کا سا اثر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں ملی حمیت بیدار کرنے میں اقبال کی نظموں نے وہی کردار ادا کیا جو مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ میں ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال ادا کر رہا تھا۔

دوسری اور تیسری شادی

۱۹۱۳ء ہی میں علامہ اقبال کا نکاح ان کے ممتاز دوستوں کی کوششوں سے موچی دروازے کے ایک معزز کشمیری خاندان کی ایک لڑکی سے ہوا جو اس وقت وکٹوریہ گرلز ہائی سکول لاہور میں پڑھتی تھی اور سردار بیگم نام تھا۔ نکاح کے وقت ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی موجود تھے۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ علامہ کو منکوحہ خاتون کے بارے میں نامناسب گمنام خطوط ملے۔ وہ تذبذب میں پڑ گئے اور رخصتی غیر معین عرصہ کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ ایک عجیب اور تکلیف دہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بیوی سے نباہ نہ ہو سکا تھا۔ دوسری سے متعلق یہ شبہ پیدا ہو گیا۔ اقبال اسی ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے کہ اقبال کے ایک دوست سید بشیر حید ر لدھیانے کے ایک مشہور دولت مند خاندان "نولکھا" کی ایک لڑکی کا رشتہ لے کر آئے۔ جو مناسب تھا غالباً ان حالات میں یہی ایک صورت رہ گئی تھی۔ کہ وہ اس نئے رشتے کو قبول کر لیں اور گھر کی ویرانی کا کچھ بندوبست کریں۔ چنانچہ رشتہ

طے ہو گیا۔ لاہور سے علامہ شادی کے لیے لدھیانے روانہ ہوتے۔ باراتیوں میں مرزا جلال الدین بیرسٹر، چوہدری شہاب الدین کے علاوہ بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی شامل تھے۔ لدھیانے میں بارات کا شاہانہ طریقے سے استقبال ہوا اور سب کی بڑی مدارت کی گئی۔ نکاح کے بعد باراتی واپس آ گئے لیکن علامہ وہیں ٹھہر گئے اور چند روز اپنی تیسری بیوی کو جنکا نام ممتاز بیگم تھا لے کر لاہور آ گئے۔ یہ دسمبر ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ چند دنوں بعد ہی گجرات والی پہلی بیوی کریم بی بی بھی لاہور پہنچ گئیں۔ دونوں انار کلی والے گھر میں علامہ کے ساتھ رہنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ لاہور والی دوسری بیوی مختار بیگم کے بارے میں تحقیق سے پتہ چلا کہ سارے الزامات غلط تھے اور ایک وکیل نبی بخش کی خود غرضانہ فتنہ پردازی کا نتیجہ تھے۔ خود علامہ کے والد ماجد نے استخارہ کر کے فرمایا کہ لڑکی پاک دامن و پاک باز ہے جب یہ انکشافات ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بے حد افسوس ظاہر کیا گیا تھا کہ علامہ نے ایک بہتان پر یقین کر لیا اور ساتھ ہی لکھ دیا:

"میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی اسی حالت میں پوری زندگی بسر کر دوں گی اور روزِ قیامت آپ کی دامن گیر ہوں گی۔"

ان حالات میں علامہ کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ انہیں گھر لائیں اور ان کے ساتھ کی گئی زیادتی کا ازالہ کریں۔ چنانچہ وہ انہیں لانے کے لیے تیار ہو گئے چونکہ وہ پہلے دل میں طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس لیے احتیاطاً ان سے دوسری بار نکاح کیا۔ رخصت کرا کر انہیں سیالکوٹ لے گئے۔ آٹھ دس دن کے بعد واپس آتے تو بڑی گرمجوشی کے ساتھ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ملے اور فرمایا "اب میں بالکل مطمئن ہوں اور

اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں"!

والدہ کا انتقال

اسی سال نومبر ۱۹۱۴ء میں اقبال کی والدہ امام بی بی سیالکوٹ میں انتقال کر گئیں۔ اقبال کو اپنی ولی صفت ماں سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ ان کی رحلت سے انہیں بہت شدید صدمہ ہوا۔ خاصے دنوں تک انہوں نے ان کا سوگ منایا۔ جب دل ذرا سنبھلا تو انہوں نے ان کی یاد میں وہ مشہور مرثیہ لکھا جو والدہ مرحومہ کی یاد میں، کے عنوان سے بانگ درا میں شامل ہے۔ اور جو اپنی تاثیر، گہرائی اور گیرائی کے لحاظ سے ان کی بہترین نظموں میں شمار ہوتا ہے۔ انہیں اپنی والدہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ جب تک زندہ رہیں تو سیالکوٹ جا کر سب سے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے وہ انہیں گلے لگا کر پیار کرتیں اور پیشانی کو چومتیں اور خوش ہو کر کہتیں کہ "میرا بالی آگیا"۔ اور دعائیں دیتی جاتیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی جب کبھی وہ سیالکوٹ جاتے تو صبح سویرے سب سے پہلے قبرستان امام صاحب میں اپنی والدہ کی قبر پر جاتے۔ فاتحہ پڑھتے اور دیر تک قرآن خوانی کرتے رہتے۔ مدت العمران کا یہ دستور رہا۔

اسرار خودی کی اشاعت

۱۹۱۱ء سے وہ جس فارسی مثنوی لکھنے میں مصروف تھے وہ ۱۹۱۵ء میں پہلی بار اسرار خودی، کے نام سے شائع ہوئی۔ اب تک لوگ ان کی اردو شاعری سے واقف تھے۔ اگرچہ اس اردو شاعری کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوا تھا اردو نظمیں اور غزلیں جستہ جستہ اخبارات

اور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس فارسی مثنوی کی اشاعت سے جو پہلی بار کتابی صورت میں اُن کے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ ہند اور بیرون ہند میں ان کی شاعرانہ اور فلسفیانہ عظمت کا شہرہ ہُوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں عالم اسلام جس سیاسی اور مذہبی ابتلا اور انتشار میں مبتلا تھا اور علاقائی قوم پرستی نے جس طرح اقوامِ عالم کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس پس منظر میں اس طویل فارسی نظم کا تلاش ذات، تعمیر خودی اور سخت کوشی کا پیغام ایک نئی زندگی کا پیغام تھا۔ یہ نظم اسلام کو اس دور میں ایک سیاسی اور سماجی قوت کی حیثیت سے پیش کرنے کی ایک بھرپور کوشش تھی جو بروقت بھی تھی۔

اسرار خودی میں روائتی اور عجمی تصوّف پر بھی کچھ تنقید کی گئی تھی۔ مثنوی کے اس پہلو پر کچھ اعتراضات بھی کئے گئے۔ جن کا انہوں نے مدلل جواب بھی دیا۔ لیکن آئندہ چند سالوں میں اقبال نے اُردو میں بہت کم لکھا۔ مولانا گرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

اُردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں۔ فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ دل کا غبار اُردو میں نہیں نکل سکتا۔" فارسی میں فکر شعر کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ اسرارِ خودی میں جس دقیق فلسفیانہ موضوع تلاش ذات اور تعمیر ذات کو اُٹھایا گیا تھا اس کا تکملہ ابھی باقی تھا۔ چنانچہ تعمیر و تشکیل ملت کے موضوع پر ان کی نظم "رموز بیخودی" اپریل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ بھی فارسی میں تھی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ فرد کی خودی کس طرح ملت کی خودی میں گم ہو کر اجتماعی قوت کا باعث بن جاتی ہے۔

اسرارِ خودی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعمیر خودی کے لیے اطاعت رسول

کو اساسی اہمیت دیتے تھے۔ عشق رسول کا جذبہ انہیں اپنے صوفی منش باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اس پر انہوں نے فکر ہی جلا کی۔ رسول مقبول سے انہیں اتنا قلبی لگاؤ تھا کہ جو چیز بھی رسول کریم کے نام سے یا مقام سے منسوب ہوتی وہ اس سے محبت کرنے لگتے تھے۔ عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں لکھا ہے۔

۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے مدینہ منورہ کا ایک کبوتر کہیں سے حاصل کر کے پالا تھا۔ وہ اس کے دانے دنکے کی فکر بنفس نفیس کیا کرتے تھے۔ نومبر کی ۲۰ر کو وہ کبوتر ایک بلی کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا اس حادثے سے اقبال بہت متاثر ہوئے اور ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

رحمت ہو تری جان پر اے مرغ نامہ بر آیا تھا اڑ کے ذروۂ بام حرم سے تو

۱۹۱۷ء میں علامہ نے ایک مختصر سا مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "رسول اللہؐ صلعم فن شعر کے مُبصر کی حیثیت میں" اس میں انہوں نے حضورؐ کی زندگی سے کئی واقعات نقل کر کے ثابت کیا کہ حضورؐ صلعم کے نزدیک آرٹ حیات انسانی کے تابع ہے۔ جو آرٹ انسان کو کاہلی، جمود، عیاشی سے نفرت دلا کر محنت، شفقت اور اکل حلال کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہی آرٹ قابل قدر ہے۔ اس مضمون میں اقبال نے صاف صاف آرٹ کا یہ نظریہ بیان کر دیا کہ فن برائے فن لغویات ہے۔ فن برائے حیات ہی صحیح نظریہ ہے۔ یہی نقطہ نظر انہوں نے "اسرار خودی" میں پیش کیا تھا۔

۱۸-۱۹۱۷ء کا دور ہندوستانی سیاست میں خاصی ہلچل کا دور تھا۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ اور کانگرس میں مشہور میثاق لکھنؤ ہو چکا تھا۔ اس وقت اقبال کسی سیاسی جماعت سے متعلق نہیں تھے۔ آٹھ دس برس بعد جب انہوں نے مسلم لیگ کی طرف سے

عملی سیاست میں قدم رکھا تو نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں انہوں نے ایک بیان دیا تھا۔
کہ وہ لکھنؤ پیکٹ کے خلاف تھے اور متحدہ قومیت کی کوششوں کو مسلمانوں کے قومی
مفادات کے منافی سمجھتے تھے لیکن اس ۱۸-۱۹۱۷ء میں ان کی کسی عملی سیاسی سرگرمی کا
سراغ نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں
کی فتح کے جشن میں ضرور شرکت کی۔ یہ جلسہ بریڈلا ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں
اقبال غالباً اپنے قریبی دوست نواب سر ذوالفقار علی خان کے اصرار پر شریک ہوئے تھے
جلسہ میں انہوں نے گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈائر کی فرمائش پر دو تین چھوٹی نظمیں سنائیں
جن کا کوئی تعلق جنگ یا فتح سے نہ تھا ان میں ایک نظم شعاعِ آفتاب تھی (جو بانگ درا میں
شامل ہے) برطانیہ کے جشن فتح میں اقبال کی شمولیت 'اسرار خودی' اور 'رموز بیخودی' لکھنے
کے پس منظر میں آج ہمیں عجیب سی بات لگتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب
ابھی انگریزی حکومت سے محاذ آرائی شروع نہیں ہوئی تھی جو ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ
کے آنے کے بعد سے واضح طور پر شروع ہوئی اس وقت تک جلیانوالہ باغ کا المیہ بھی
پیش نہیں آیا تھا۔ رولٹ ایکٹ ایک کالا قانون تھا جو شہری آزادی سلب کرنے کی
کوشش کا بدترین مظاہرہ تھا۔ رولٹ ایکٹ کے نافذ ہونے سے اقبال کا کیا ردعمل ہوا
اس کے بارے میں خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب 'اقبال درون خانہ' میں لکھا ہے:۔

اس زمانہ میں میری والدہ کی عمر سات برس کی تھی اور وہ نانا جان (اقبال) کے ساتھ
ان کے انارکلی والے مکان میں رہتی تھیں۔ ان کا بیان ہے انارکلی سے رولٹ بل کے خلاف
ایک بڑا جلوس گزر رہا تھا۔

رولٹ بل ہائے ہائے کے نعرے لگ رہے تھے بڑا جوش و خروش تھا۔ دفعتاً

شور اُٹھا کہ گولی چل گئی۔ پھر خون سے لت پت لاشوں سے بھری فوجی گاڑیاں سامنے سے گزریں یہ روح فرسا نظارہ دیکھ کر چچا جان (اقبال) کا چہرہ غصے اور ضبط سے تمتما رہا تھا۔ چچی سرداراں بیگم بھی ساتھ کھڑی تھیں ان سے ضبط نہ ہوا وہ رو پڑیں اور روتے ہوتے ان سے کہا "ظالموں نے کتنی ماؤں کے لال موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ پہلے تو وہ دل گیر انداز سے خاموش رہے پھر رندھی ہوئی آواز میں کہا: میرے مولا کو یہی منظور ہے سرتابی کی مجال نہیں وہ ان شہداء کی قربانیاں ضرور قبول کرے گا۔ جنہوں نے عروس آزادی کی مانگ کے لیے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش کیا ہے۔ اتنا کہا پھر سر جھکا لیا۔ اس وقت ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس ہوئے۔ مسلم لیگ کے جلسہ کی صدارت حکیم اجمل خان نے کی تھی۔ علامہ اقبال جب جلسہ میں داخل ہوئے تو علی برادران (محمد علی شوکت علی) کے ساتھ بغل گیر ہوتے چونکہ وہ سیاسی قید سے رہا ہو کر سیدھے جلسہ گاہ میں آتے تھے۔ علامہ نے ان کی قید و بند پر چند برجستہ شعر بھی سناتے۔ لیکن وہ مسلم لیگ یا تحریک خلافت سے وابستہ نہ تھے۔ ترکی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس سے بہت متاثر تھے۔ لیکن تحریک خلافت میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے سیکرٹری تھے۔ جب علی برادران تحریک عدم تعاون میں ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے لاہور آئے تو وہ درگزر کر گئے۔ عملی سیاست سے یہ گریز بے وجہ نہ تھا۔ اول تو وہ اپنی تیسری فارسی تصنیف پیام مشرق کی ترتیب میں مصروف تھے۔ دوسرے متحدہ قومیت کے نصب العین اور وطنیت کے سیاسی تصور سے انہیں کوئی امید

خبر نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس کی سرگرمیوں سے لاتعلق تھے دوسرے وہ اس بات کے قائل بھی نہ تھے کہ ہندوستان میں کوئی ایسی قوم موجود ہے یا بن سکتی ہے جسے ہندوستانی قوم کہا جاسکے چنانچہ صرف ایک ہی سال بعد اس تحریک کے خاتمہ پر شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کے ہنگاموں نے علامہ کے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ محض انگریز دشمنی کی بنا پر کسی قومیت کی تعمیر نہیں ہوسکتی۔

عملی سیاسی ہنگاموں سے لاتعلقی کے باوجود علامہ ہندی مسلمانوں اور مسلمانانِ عالم خصوصاً ترکی کے سیاسی حال اور مستقبل میں پوری دلچسپی لے رہے تھے انہوں نے سیاسی بصیرت سے جنگ عظیم کے پس منظر میں اقوام مغرب کی ذہنیت کا بھرپور تجزیہ کیا۔ اور مسلمانانِ عالم کو ایک نیا طرزِ احساس دیا، پرشور، پرجوش اور ہیجانی سیاست کے اس دور میں اقبال نے ایک نپی تلی سنجیدہ، پروقار اور فکر انگیز نظم 'خضرِ راہ' لکھ کر قوم کی فکری قیادت کا حق ادا کر دیا۔ خضرِ راہ' انہوں نے ۱۶ / اپریل ۱۹۲۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں ہزاروں مسلمانوں کے مجمع میں پڑھی اور بے انتہا داد پائی۔ اس بے مثال نظم میں انہوں نے جنگ عظیم کے دوران اقوام غالب کی تباہ کاری، اور اس کے بعد ان کی سیاست کاری، قدیم سرمایہ دارانہ نظام کی فریب کاری، مزدوروں کی تحریک بیداری۔ عالم اسلام کی زبوں حالی اور ترکان عثمانی کی بے دست و پائی پر بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے اور آخر میں کھلی ہوئی انسانیت کو ایک نئے نظم عالم کی بشارت سُنائی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی 'خضرِ راہ' میں شادمانی اور اُمید کا عنصر کم ہے۔ اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ ترکی موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھا اور ہندوستان کے مسلمان جوش و خروش کے عالم میں ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا انجام انہیں معلوم نہ تھا۔ لیکن جب ۱۹۲۳ء میں علامہ نے انجمن ہی کے اجلاس

میں طلوعِ اسلام پڑھی تو حالات بدل چکے تھے۔ طلوعِ اسلام میں اقبال نے جنگ عظیم کے پیدا کردہ عالمی مسائل کی طرف اشارے کیے ہیں۔ عالمِ اسلام کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی پُر جوش رجائی انداز میں یہ بتلایا ہے کہ مغرب کا یہ طوفان ملتِ اسلامیہ کے لیے نیک فال ہے۔ اس کی وجہ سے عالمِ اسلام میں بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ مصطفیٰ کمال کی کامیابیاں دراصل عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی لہریں ہیں۔ اس لیے وہ مردِ غازی ہے۔ ایک دیدہ ور ہے۔ اقبال نے کہا: جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد عالمِ اسلام میں جو دل شکن واقعات پیش آئے ہیں ان سے نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ سے عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑ رہا ہے اور طوفان و گرداب کے طمانچے کھا کر مسلمان، اب "مسلمان" بننے لگا ہے۔

اقبال نے اس بے نظیر نظم میں جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ ایک حد تک بعد میں صحیح ثابت ہوئیں۔ یورپ کا مرد بیمار (ترکی) موت کے پنجے سے نکل چکا تھا۔ ایران کو رضا شاہ نے روس اور انگریز کے اثرات سے بچا لیا تھا۔ مصر نے سعد زاغلول پاشا کی قیادت میں آزادی کی جنگ شروع کر دی تھی۔ شام، عراق اور فلسطین میں عرب اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے غرضیکہ ممالک اسلامیہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑنے لگی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا سہارا دیا اور ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراطِ مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا۔ غیر سیاسی اقبال کی یہ بہت بڑی سیاسی خدمت تھی۔

علامہ عملی سیاست کے کارزار میں عملی حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن شاعری کے ذریعہ سیاسی تبصرے کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۲۰ء، ۲۱، ۲۲ء کے زمیندار اخبار میں ان کے سیاسی

اشعار و قطعات چھپتے رہتے تھے۔ عبدالمجید سالک کا بیان ہے کہ اس زمانے میں علامہ نے اکثر ظریفانہ اشعار لکھے جواب بانگ درا کے آخر میں ملتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کے بڑے گہرے مبصر تھے۔ مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے منچلے نوجوانوں نے شاہ عالمی میں ہندوؤں کے ایک مندر کی تعمیر کے جواب میں راتوں رات ایک مسجد بنا ڈالی۔ اقبال نے متاثر ہو کر تبصرہ کیا۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

دسمبر ۱۹۲۲ء کے اواخر میں اقبال انار کلی بازار کے بالاخانے سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی ایک پرانی کوٹھی میں منتقل ہو گئے یہ بہت ہی بوسیدہ حالت میں تھی اور اس قابل نہ تھی کہ اقبال اس میں رہتے۔ عبدالمجید سالک ان سے ملنے گئے تو اس کوٹھی میں ان کے منتقل ہونے پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ عرض کیا:

"حضرت، کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہیں ملتی تھی یہ تو بہت ہی پرانی ہے"۔ ہنس کر فرمایا:

"جی ہاں یہ تو صرف میری دعاؤں ہی کے سہارے کھڑی ہے ورنہ اس میں قائم رہنے کی تو کوئی بات باقی نہیں"۔ اسی کوٹھی کا وہ پونے دو سو روپیہ کرایہ بھی دیتے تھے جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا۔ احباب کے اصرار پر کہ ایسی کوٹھی کا وہ اتنا زیادہ کرایہ کیوں دیتے ہیں علامہ نے فرمایا "یہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے جس کے بچوں کی گزران اسی کوٹھی کے کرائے پر ہے۔ مجھے کوٹھی چھوڑتے یا کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے شرم آتی ہے"۔ میکلوڈ روڈ کی اس کوٹھی میں منتقل ہونے کے بعد اقبال نے باہر آنا جانا اور بھی کم کر دیا۔ تفکر کی عادت نے غلبہ پا لیا اس

زمانے میں اقبال بہت سے علمی اور دینی مسائل پر غور و خوض اور مطالعہ میں معروف تھے ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون فقہ اور جہاد کے بہت سے مسئلوں کے علاوہ زمان و مکان کے متعلق بھی تحقیق و تدقیق کر رہے تھے اور سید سلیمان ندوی وغیرہ بہت سے علماء سے خط و کتابت کے ذریعہ استصواب رائے کرتے رہتے تھے۔

سر کا خطاب

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سرکار برطانیہ نے اقبال کو سر کے خطاب سے نوازا۔ تحریک ترک تعاون کے پس منظر میں اقبال کا حکومت سے تعاون کا یہ مظاہرہ بعض حلقوں میں تعجب اور بدگمانی کا سبب بنا۔ زمیندار اخبار میں پھبتیاں بھی کسی گئیں۔ اقبال کے ایک ارادت مند میر غلام بھیک نیرنگ نے خدشہ کا اظہار کیا کہ اب شاید وہ آزادی اظہار سے کام نہ لے سکیں اس پر علامہ نے ان کو خط میں لکھا: قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان و آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دُنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے"۔

خطاب کی پیش کش کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء میں لاہور چیف کورٹ کی چیف جسٹس سر شادی لال نے بلا کر ان سے کہا کہ حکومت نے مجھ سے خطابات کے لیے سفارشیں طلب کی ہیں اور میں آپ کے لیے خان صاحب کے خطاب کی سفارش کر رہا ہوں علامہ نے بگڑ کر کہا میں کسی خطاب کا خواہاں نہیں ہوں۔ آپ ہرگز سفارش کی زحمت نہ فرمایئے۔ سر شادی لال نے کہا کہ اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ مزید غور کر لیجئے۔ علامہ نے فرمایا: میں

غور کر چکا ہوں۔ مجھے خطاب کی ضرورت نہیں۔ دو تین دن بعد شادی لال نے علامہ کو بلا بھیجا۔ آپ نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا اگر خطاب کے سلسلہ میں گفتگو کرنا مقصود ہے تو میرا جواب آپ کو معلوم ہے اور میں اسی پہ قائم ہوں۔ ہاں اگر کوئی اور بات کرنی ہے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

اس زمانے میں پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن تھے جن سے نواب سر ذوالفقار علی خان کے گہرے تعلقات تھے۔ سر ذوالفقار علی اقبال کے قریبی دوست اور مداح تھے۔ ان ہی نے اقبال پر انگریزی میں پہلی کتاب (مشرق سے ایک آواز) ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی۔

ایک دن نواب صاحب نے گورنر سے ذکر کیا کہ مشہور بنگالی شاعر ٹیگور کو خطاب مل چکا ہے۔ لیکن اقبال جو بہت بڑے شاعر اور مسلمانوں کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں اب تک قدر دانی سے محروم ہیں۔ گورنر نے کہا بہت اچھا انہیں خان بہادر بنا دیا جائے گا۔ نواب صاحب نے کہا یہ اقبال کی ہتک ہے۔ پھر گورنر نے کہا شمس العلماء کیسا رہے گا؟ سر ذوالفقار علی نے جواب دیا:
"یہ بھی مناسب نہیں"۔

کچھ دنوں کے بعد گورنر پنجاب نے علامہ کو گورنمنٹ ہاؤس میں دعوت دی جب علامہ وہاں پہنچے تو گورنر نہایت تپاک سے ملے اور بتایا کہ لندن ٹائمز کے ایک مشہور مقالہ نگار آئے ہوتے ہیں اور میرے پاس ہی مقیم ہیں وہ آپ سے ملاقات کے بے حد خواہاں تھے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے اس مقالہ نگار نے اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا تھا (جو پروفیسر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں انگریزی میں کیا تھا) مشرق وسطیٰ کے جن جن ملکوں میں وہ گیا تھا ان کے علمی و ادبی حلقوں میں علامہ اقبال کے کمالات کا چرچا بھی سن آیا تھا اس کے علاوہ اُس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کے متعلق وہ علامہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ صحبت دو تین گھنٹے تک جاری رہی۔ آخر میں سر ایڈورڈ میکلیگن نے

علامہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں آپ کے لیے سر کے خطاب کی سفارش کروں علامہ نے کہا: اسلام سماجی امتیازات کو پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی میں خطابات اور اعزازات کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ علامہ کے انکار سے گورنر مکدر ہوئے اور اسے سیاسی اختلاف پر محمول کیا رفع شر کے لیے علامہ نے کہا اگر آپ کو اصرار ہے تو یوں ہی سہی۔ گورنر نے اقرار کو عزت افزائی سمجھا اس کے بعد میکلیگن نے علامہ سے دریافت کیا آیا آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلماء کے خطاب کے لیے موزوں ہے؟ علامہ نے فرمایا: میں ایک شرط پر نام پیش کرنے کو تیار ہوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے۔ میکلیگن نے کسی قدر تامل کے بعد شرط قبول کرلی۔ علامہ نے فرمایا میرے نزدیک مولوی میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ میکلیگن نے کہا، میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے کیا انہوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں؟ علامہ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں وہ میرے استاد محترم ہیں "گورنر نے نہ صرف ان کی سفارش کا احترام کیا بلکہ ان کے ایما پر بوڑھے اور درویش صفت مولوی میر حسن کو شمس العلماء کے خطاب کے سلسلہ کی درباداری کے جھنجھٹ سے بھی مستثنیٰ کردیا۔ یہ ہے اقبال کے "سر" ہونے کی روداد جوان کے قریبی دوستوں اور نیازمندوں نے روزگار فقیر اور ذکر اقبال نامی کتابوں میں بیان کی ہے۔

کونسل کی رکنیت

علامہ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور علمی وقار کے پیش نظر علامہ کے احباب اور نیازمند

ہمیشہ انہیں پنجاب کونسل میں بطور امیدوار کھڑے ہونے کا مشورہ دیا کرتے تھے ۱۹۲۳ء کے انتخابات کا وقت آیا تو دوستوں نے اصرار کیا، اخباروں نے اپلیں کیں۔ عوام نے وفد بھیجے غرض ان کو بے حد مجبور کیا گیا کہ وہ لاہور سے کونسل کی ممبری کے لیے امیدوار کھڑے ہو جائیں۔ لیکن چونکہ اسی حلقے سے میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کی امیدواری کا اعلان ہو چکا تھا اور علامہ سے میاں صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے علامہ کی مروت نے ان کے مقابلہ میں کھڑے ہونا گوارا نہ کیا۔

پیام مشرق کی اشاعت

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کی کتاب "پیام مغرب" کے جواب میں جو فارسی کتاب وہ چند برس سے لکھنے میں مصروف تھے۔ وہ پیام مشرق کے نام سے یکم مئی ۱۹۲۳ء کو شائع ہوئی اس میں نامور اشتراکی رہنما لینن پر بھی ایک نظم تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ دور ختم ہوا جب انسان چکی کے پاٹوں میں دلنے کی طرح پستا تھا اور فریب قیصر وزار اور دام کلیسا میں گرفتار تھا۔ اب تو بھوکے غلام نے تنگ آکر آقا کا گریبان پھاڑ ڈالا جو غریبوں کے لہو سے رنگین تھا۔ عوام کے جوش غضب نے پیشواؤں کے عمامے اور بادشاہوں کی قبائیں جلا کر راکھ کر دی ہیں۔" اس سے پہلے ۱۹۲۲ء میں منظر عام پر آنے والی نظم خضر راہ میں بھی مزدور دل اور محنت کشوں کی اٹھتی ہوئی قوت کو ہمدردی، استحسان اور اُمید کی نظروں سے دیکھنے کے اشارے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ سرمایہ پرستی کی لعنتوں پر تنقید کی جائے اور محنت کش اور مزدور طبقہ کے جائز مطالبات کی حمایت ہو۔ ان اشعار کو ان کے فکری پس منظر سے ہٹا کر ایک صحافی شمس الدین حسن نے (جو کمیونسٹ خیالات رکھنے کے باعث حکومت کے زیر عتاب

تھا) اپنی برأت میں یہ دلیل پیش کی کہ اقبال کے بھی تو بے شمار اشعار کمیونزم کے حق میں ہیں۔ اس الزام کے جواب میں ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کو اقبال نے زمیندار اخبار میں ایک خط چھپوایا "بالشویک (تشدد اور انتہا پسند کمیونسٹ) خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو خود قرآن نے ہمیں بتائی ہے"۔ اقبال کا یہ بیان فکرِ اقبال کی صحیح سمت متعین کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

۸ جولائی ۱۹۲۳ء کو اقبال دوسری بار انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء کو وہ اس عہدے سے سبکدوش ہو کر کثرت رائے سے انجمن کے صدر منتخب ہو گئے۔ ان کے صدر منتخب ہونے کے معنی یہ تھے کہ انجمن کی صدارت پر امیر کبیر یا بارسوخ طبقہ کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور اوسط طبقہ کے ایک فرد کو محض اپنے علمی وقار اور شخصی امتیاز کی بدولت اس منصب پر فائز ہونے کا موقعہ ملا لیکن علامہ کو یہ صدارت راس نہ آئی اور [illegible] جون کو وہ انجمن کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔

بانگ درا کی اشاعت

ستمبر ۱۹۲۴ء میں سر شیخ عبدالقادر کے دیباچہ کے ساتھ بانگ درا کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کو علامہ نے تین چار ماہ کی محنت کے بعد خود مرتب کیا تھا۔ اس میں شامل نظموں اور غزلوں میں کافی کانٹ چھانٹ کی گئی تھی اور بعض نظموں اور اشعار کو بالکل قلم زد کر دیا گیا تھا۔ اب یہ قلم زدہ اشعار اور ترمیم کیے ہوئے ٹکڑے اپنی اصل صورت میں اخباروں اور رسالوں کے فائلوں سے تلاش کر کے باقیات اقبال کے نام سے شائع کر دیئے گئے ہیں۔

جاوید کی ولادت

علامہ کی دوسری اور تیسری شادی کو آٹھ دس برس گزر چکے تھے لیکن علامہ ہنوز اولاد کی نعمت سے محروم تھے ایک دن لاہور والی زوجہ سردار بیگم کو دیکھا کہ طوطے کے پنجرے کے پاس کھڑی ہیں اور پیار سے طوطے کو چوری کھلا رہی ہیں اور پیار سے باتیں کر رہی ہیں جیسے ماں بچے کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا۔ کہنے لگے۔ اس عورت میں ممتا بیدار ہو چکی ہے۔ یا اللہ اسے اولاد سے نواز، اور اپنے والد گرامی سے بھی دعا کے لیے گذارش کی۔ انہوں نے کشف کے بعد فرمایا: ہاں گود ہری ہو جائے گی۔ ناک سے سونے کی نتھ اتار دے۔ چنانچہ نتھ اتار دی گئی۔ دُعا کا اثر تھا کہ کیا کرنا ایسا ہوا کہ لاہور والی اور لدھیانے والی دونوں بیگمیں امید سے ہو گئیں۔ بچہ کی ولادت کے لیے علامہ نے لاہور والی سردار بیگم کو سیالکوٹ بھیج دیا اور لدھیانے والی ممتاز بیگم اپنے میکے چلی گئیں۔ ۵۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو سیالکوٹ میں بیٹا ہوا۔ جس کا نام جاوید رکھا گیا۔ سارے خاندان نے روایتی انداز میں بڑی خوشیاں منائیں ادھر لدھیانے سے اچھی خبر آنے کی اُمید تھی۔ کہ یکایک ممتاز بیگم کی علالت کی اطلاع ملی۔ ۱۹ اکتوبر کو علامہ لدھیانے روانہ ہو گئے۔ دیکھا تو اہلیہ کی حالت تشویشناک تھی۔ نمونیہ کا حملہ ہوا تھا۔ اسی حالت میں وضع حمل کی پیچیدگیوں کے سبب انتقال کر گئیں۔ علامہ چونکہ ان کی وفات کے وقت اُن کے قریب تھے ان کی تکلیف اور بے بسی سے بہت متاثر ہوئے۔ وفات کے دوسرے دن قطعہ تاریخ وفات لکھا۔ رسم قل ادا ہو جانے کے بعد علامہ دل شکستہ لاہور واپس آئے۔ مرحومہ کے بھائیوں نے ان کا تمام زیور اور سامان واپس کر دیا۔ ہر چند کہ انہوں نے کہا بھی شریعت کی رُو سے اس کے بیشتر حصے کے وارث مرحومہ کے بھائی بہنیں ہیں اس واقعہ کے بارے میں چند روز بعد انہوں نے

بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو لکھا۔

"اب ارادہ ہے کہ یہ ترکہ اس کی کسی یادگار کی صورت میں صرف کیا جائے۔ کچھ روپیہ میں اور اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دوں گا۔ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو بہت اچھی صورت ہو جائے گی" ممتاز بیگم کی ناگہانی موت کا انہیں گہرا صدمہ ہوا تھا۔ مرحومہ کی لوح مزار خود تیار کرا کے لاہور سے بھجوائی۔ جب تک وہ زندہ رہیں ان سے ان کا سلوک بہت اچھا تھا۔ علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے روز گار فقیر میں روایت ہے وہ اور ہماری لاہور والی سردار بیگم چچی جان قریباً دس گیارہ سال ایک ہی مکان میں چچا جان کے ساتھ رہیں۔ ان کے درمیان سوکنوں والا تنازعہ کبھی میرے علم میں نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی چچا جان دونوں میں انتہائی عدل مدنظر رکھتے تھے اور ایک کو دوسری پر کسی قسم کی فوقیت نہیں دیتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں غزل

اسی سال ۱۹۲۴ء میں اکتوبر کی تیس تاریخ کو انجمن حمایت اسلام کے بھاٹی دروازہ کے سالانہ جلسہ میں علامہ نے مشہور غزل کے چند شعر سنائے جس کا پہلا شعر ہے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

عدالت عالیہ کی ججی کا مسئلہ

۱۹۲۵ء میں لاہور چیف کورٹ میں ایک مسلمان جج کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا۔ عوام و خواص نے مطالبہ کیا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاء کو

ان کی بے نظیر قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا جائے۔ تو سر شادی لال چیف جج نے جس کے ساتھ علامہ کی ان بن ہو چکی تھی، علامہ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی: ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال جج نہ ہو سکے۔ اسی اثنا میں حیدر آباد دکن میں ان کی ججی کا مسئلہ پیش ہوا۔ تو وہاں بھی بعض دوستوں کی منافقت کی وجہ سے ان کا تقرر نہ ہو سکا۔

کفر کا فتویٰ

اقبال کے افکار سے خصوصاً ان کے ابن سعود کی حمایت میں بیان دینے سے قدامت پسند عوام اور علماء کا ایک فرقہ ان سے خوش نہیں تھا اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک صاحب نے سنجیدگی سے یا خوش طبعی سے مسجد وزیر خان لاہور کے خطیب سے اقبال کے بارے میں ان کی بانگ درا کی بعض نظموں آفتاب، رام اور شکوہ کو بنیاد بنا کر استفتاء کیا۔ ان حضرت نے جھٹ کفر کا فتویٰ داغ دیا جس پر بڑی لے دے ہوئی۔ ذکر اقبال میں ہے:
مسلمانوں کے تمام طبقات، عالم، عامی، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان، عاشق رسول، درد مند ملت، حامیٔ دین اسلام سمجھتے تھے اور کہتے تھے اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے۔

مجلس قانون ساز پنجاب کی رکنیت

ملکی سیاست سے نظری دلچسپی تو اقبال کو ۱۹۰۱ء ہی سے تھی جب انہوں نے متحدہ قوم پرستی کے جذبات پر مبنی اپنی پہلی نظم ہمالہ لکھی تھی۔ اس کے بعد سے ان کی بیشتر شاعری سیاسی

ہی ہے۔ ملکی سیاست یا ملی سیاست پر مبنی۔ لیکن ۱۹۲۵ء تک انہوں نے براہ راست عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے انتخاب میں حصہ لینے پر تیار بھی ہو گئے تھے۔ لیکن آخر کار مروتاً ایک دوست کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء کے اوائل میں عوام و خواص نے پھر اصرار کرنا شروع کیا کہ علامہ لاہور کے مسلم حلقہ سے پنجاب مجلس قانون ساز کے لیے کھڑے ہوں۔ اس بار ملک کے حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا تھا کہ انہیں عملی سیاست کاری کے میدان میں اترنا پڑا۔ چنانچہ علامہ نے ۲۰، جولائی ۱۹۲۶ء کے بیان میں انتخاب میں حصہ لینے کے فیصلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:
میں اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کروں شاید میرا ناچیز وجود اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے۔" چنانچہ اقبال نے انتخاب لڑا۔ لیکن انہوں نے عام انتخابی ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے۔ ان کے جاں نثار عقیدت مند ہی دوڑ دھوپ کرتے رہے" اقبال درون خانہ" میں لکھا ہے کہ انتخاب کے روز اقبال گھر میں رہے اور اپنے معمولات میں خلل نہیں پڑنے دیا۔ جب کامیابی کا اعلان ہوا تو نیاز مند جلوس کی شکل میں آئے اور شہر میں کامیابی کے جلوس کی قیادت کرنے کی استدعا کی۔ اقبال نے باہر نکلنے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ نام و نمود کے بکھیڑوں میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اہل جلوس کے بے حد اصرار کے باوجود وُہ جشن کا ہنگامہ برپا کرنے کی اجازت دینے پر راضی نہ ہوئے اسی طرح کا ایک واقعہ عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں درج کیا ہے۔ ۲۳، نومبر ۱۹۲۸ء کو ان کے پنجاب مجلس قانون ساز کا ممبر منتخب ہونے کا اعلان ہونے پر تمام صوبے میں مسرت کا اظہار کیا گیا فیروز پور شہر کے معززین نے بھی آپ کو استقبالیہ دینے کا اہتمام کیا۔ پروگرام یہ تھا

کہ پہلے آپ کا جلوس نکالا جائے گا۔ اور تیسرے پہر آپ ایک مشاعرہ کی صدارت کریں گے شام کو ایک گارڈن پارٹی میں آپ مہمان خصوصی ہوں گے۔ علامہ نے فرمایا: ''جلوس میں، میں ہرگز شامل نہ ہوں گا یہ میرے ذوق کے خلاف ہے''۔ مشاعرے کی صدارت سے بھی معذرت کی۔ صرف پارٹی میں شرکت کرنا گوارا کیا۔ مشاعرے میں صرف دو شعر فارسی کے پڑھے

زبورِ عجم کی اشاعت

۱۹۲۳ء سے علامہ عملی سیاست کے خارزار میں قدم رکھ چکے تھے۔ لیکن شاعری جاری تھی۔ وہ بھی بیشتر فارسی میں۔ چنانچہ جون ۱۹۲۷ء میں فارسی غزلوں کا ایک نادر مجموعہ زبورِ عجم کے نام سے شائع ہوا۔ اسی ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں اسلامی کلچر کی روح کے عنوان سے انگریزی میں ایک بصیرت افروز تقریر کی۔

۱۹۲۷ء میں زیادہ وقت اقبال نے عملی سیاسی سرگرمیوں میں گزارا۔ انہوں نے اسمبلی کی کارروائیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ہندوستان کی آئندہ اصلاحات کے متعلق حکومت برطانیہ کی طرف سے سرجان سائمن کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن کا اعلان ہوا۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا اگر اہل ہند اپنے ملک کے لیے ایک آئین متحدہ طور پر تیار کر لیں تو حکومت اس کو قبول کر کے نافذ کر دے گی۔ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے کانگریس نے پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے نہرو رپورٹ مرتب کی لیکن چونکہ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے بنیادی مطالبات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لیئے مسلمانوں کی تمام جماعتوں۔ مسلم لیگ۔ خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند نے اس سے اختلاف کیا۔ اس سے قبل گاندھی جی نے دہلی میں مسلمان رہنماؤں

کو گفتگو کی دعوت دی تھی۔ علامہ اقبال بھی تشریف لے گئے جب گاندھی جی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا اگر مسلمانان ہند متفقہ طور پر اپنے مطالبات معین کر دیں تو کانگریس ان کو منظور کر لے گی۔ اس پر علامہ اقبال نے برجستہ فرمایا: یہ تو آپ نے بالکل لارڈ برکن ہیڈ کی سی بات کی۔ اس کا گاندھی جی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ سائمن کمیشن میں کوئی ہندوستانی ممبر شامل نہیں تھا۔ اس کے غیر نمائندہ حیثیت کو دلیل بنا کر کانگریس نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ حکومت نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہندوستانیوں میں فرقہ وارانہ اختلافات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے نمائندوں کا کمیشن میں شامل کرنا محال ہے۔ ہندوستان کے آئندہ آئینی ڈھانچے کے متعلق ہندو مسلمانوں میں واقعی بنیادی اختلاف موجود تھے۔ جن کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے علامہ اقبال نے یہ موقف اختیار کیا مسلمان کمیشن کا بائیکاٹ نہ کریں بلکہ کمیشن کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کریں۔ لیکن مسلم نقطہ نظر کیا ہے۔ اس پر تمام متعلق مسلمانوں کے لیڈر متفق نہیں تھا۔ سیاسی صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہندو اور ان کے قوم پرست مسلمان ساتھی مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور مسلمانوں کے لیڈر جداگانہ انتخابات پر مصر رہے تھے۔ ہندو لیڈر مسلمانوں کو وہ زائد از استحقاق نشستیں دینے پر بھی آمادہ نہ تھے جو میثاق لکھنؤ میں طے کی گئی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ بعض مسلم لیگی رہنما بھی جن میں مسٹر محمد علی جناح پیش پیش تھے بعض تحفظات کے ساتھ ساتھ مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر آمادہ تھے جب مارچ ۱۹۲۷ء میں دہلی کے مقام پر زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح مسلم ارکان اسمبلی اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں یہ تجاویز منظور کی گئیں کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل صوبہ قرار دیا جائے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات جاری کی جائیں۔ پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلم اکثریت محفوظ اور مسلم قرار دی

جائے مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے اگر یہ تجاویز قبول کرلی جائیں تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب منظور کرلیں گے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ان تجاویز کو منظور کرلیا اور تصدیق کر دی۔ علی برادران۔ محمد علی شوکت علی اور مسٹر جناح بھی ان تجویزوں کے حامی تھے لیکن مسلم لیگ کے پنجاب گروپ نے سر محمد شفیع کی رہنمائی میں مسلم لیگ کی اس "مخلوطی" پالیسی سے اختلاف کیا اور لیگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ایک کے صدر مسٹر محمد علی جناح اور سیکرٹری ڈاکٹر کچلو قرار پائے اور دوسرے کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال مقرر ہوئے۔ مخلوطی گروپ بنیادی طور پر متحدہ قومیت کے فلسفہ کے حامل تھا۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ متحدہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے تاکہ متحدہ قومیت کے تصور کے آئیڈیل حصول آزادی کو قریب تر لایا جائے۔ علامہ چونکہ بنیادی طور پر علیحدہ قومیت کے داعی تھے اس لیے وہ متحدہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کو تحفظ دینا چاہتے تھے۔ اسی اصولی اختلاف کی وجہ سے وہ کمیشن کے بائیکاٹ کے خلاف تھے مولانا محمد علی نے لاہور آکر علامہ کو کمیشن کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کرنے کی بڑی کوشش کی علامہ نے جواب دیا اگر کانگریس اور ہندو لیڈر مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر کے پہلے فرقہ وار مسائل کو سلجھا لیں تو میں کمیشن سے تعاون کرنے کے نقطہ نظر سے دست بردار ہو جاؤں گا اور سر شفیع کو بھی کمیشن کے بائیکاٹ پر آمادہ کرلوں گا۔ اس معاملہ میں مولانا حسرت موہانی بھی علامہ کے مؤقف کے حامی تھے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بنیادی مطالبات ماننے پر راضی ہوئے نہ مولانا محمد علی علامہ کو ہم خیال بنا سکے۔ شفیع لیگ نے جس کے سیکرٹری علامہ تھے طے کیا کہ لیگ کی طرف سے ایک یادداشت سائمن کمیشن کو بھیجی جائے۔

اس کا مسودہ مرتب کرنے کے لیے مئی ۱۹۲۸ء میں لیگ کا جو اجلاس ہوا اس میں علامہ نے بعض اہم امور کے متعلق جن میں صوبائی خود مختاری کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ کھل کر اختلاف رائے کیا۔ آخری یادداشت ابھی مرتب ہونا باقی تھی کہ علامہ پر درد گردہ کا دورہ پڑا (اس سے پہلے ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس دورے سے دوچار ہوئے تھے) اور وہ حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کے لیے دہلی چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں شفیع لیگ نے جو یادداشت تیار کی اس میں مکمل صوبائی خود مختاری کا مطالبہ شامل نہ تھا۔ علامہ کا شروع ہی سے موقف یہ تھا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو مکمل صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرنا چاہیے اسی لیے وہ متحدہ قومیت اور مخلوط انتخابات کے تصورات کے مخالف تھے۔ شفیع لیگ کی یادداشت سے اصولی اختلاف کی بنا پر انہوں نے اس کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ سر شفیع نے ان کے احتجاج کی بنا پر لیگ کی یادداشت میں ترمیم کی اور صوبائی خود مختاری کے مطالبے کو یادداشت میں شامل کر لیا۔ چنانچہ اس کے بعد علامہ نے بھی یادداشت پر دستخط کر دیئے۔ ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو مسلم لیگ کا ایک وفد سر محمد شفیع کی قیادت میں سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دینے کے لیے پیش ہوا۔ اس میں علامہ بھی شریک غالب تھے۔ بعض سوالات کا جواب انہوں نے ہی دیا چنانچہ سائمن کمیشن نے بہت سے معاملات میں وفد کے نقطہ نظر کی تائید کی۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

نہرو رپورٹ سوال پر مسلمان رہنماؤں میں شدید اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ مسلم قوم پرست (نیشنلسٹ) گروہ اس رپورٹ کا حامی تھا۔ دوسرا گروہ جس کے قائد مسٹر محمد علی جناح

تھے۔ اس میں کچھ ترمیمات کرانے کا خواہش مند تھا تیسرا گروہ کلیتہً اس کا مخالف تھا۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم نہ کی گئی تھی اور ان کا کوئی بنیادی مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا تھا اس گروہ کے لیڈر سر محمد شفیع اور علامہ اقبال تھے۔ مسٹر جناح کی طرف سے نہرو رپورٹ میں معمولی سی ترمیمات کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ سب ناکام رہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال اور بعض زعماء کی تحریک سے جنوری ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں تمام مقتدر لیڈروں کے علاوہ ہندوستان بھر کی کونسلوں اور اسمبلیوں کے منتخب شدہ مسلم ممبر شریک ہوئے۔ سر آغا خان اس کانفرنس کے صدر تھے۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے تمام سیاسی مطالبات کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی (اس قرارداد میں علامہ اقبال کے بنیادی مؤقف جداگانہ حق انتخاب اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم اکثریت کے تحفظ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی) بعد میں مسٹر محمد علی جناح نے بھی اپنے چودہ نکات اسی قرارداد کے اصول پر مرتب کیے اور دونوں مسلم لیگیں دوبارہ ایک ہو گئیں۔ بالواسطہ طور پر یہ علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی کامیابی تھی۔

علامہ کا کردار پنجاب اسمبلی میں

اگرچہ علامہ کو یقین تھا کہ ان کونسلوں میں کوئی مؤثر قومی خدمت انجام دینا بے حد دشوار ہے اس کے باوجود انہوں نے بعض مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار پوری قوت اور سرگرمی سے کیا۔ اراضی کے معاملے کے سوال پر انہوں نے عالمانہ بحثیں کیں اور مزارعین کے حقوق کے تحفظ پر زور دیا۔ علامہ ہی کی کوششوں سے مذہبی توہین کے خلاف قانون نافذ ہوا۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے کھلے مقابلے کے سوال پر انہوں نے نامزدگی اور کھلے مقابلے کے ملے جلے طریقے کی حمایت

کی ۲۸-۱۹۲۷ء کے بجٹ پر علامہ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے دو تجویزیں پیش کیں ایک یہ
کہ دیہات میں صفائی اور حفظان صحت کا بہتر انتظام کیا جائے اور ایک رقم خاص طور پر
عورتوں کی طبی امداد کے لیے مخصوص کر دی جائے۔ دوسری تجویز میں آپ نے مالیے میں تخفیف
کرنے اور انکم ٹیکس کی طرح تدریجی قابلیت ادائیگی کے اصول کو اپنانے پر زور دیا۔ اس
کے علاوہ آپ نے لازمی ابتدائی تعلیم پر بے حد زور دیا اور فرمایا کہ صرف چند مدرسوں میں
ابتدائی تعلیم لازمی قرار دینے سے مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ پورے صوبے میں لازمی تعلیم نافذ
ہونی چاہیے اور اس پر سختی سے عمل ہونا چاہیے۔

۷ مارچ ۱۹۳۰ء کو بھی علامہ نے بجٹ سیشن میں ایک جامع اور دلچسپ تقریر
کی جس میں آمدنی کو بڑھانے اور مصارف کو کم کرنے کے لیے ضروری تجاویز پیش کیں۔
صنعتی ترقی پر بے حد زور دیا۔ تعلیم کے سلسلہ میں جو مصارف کیے گئے تھے ان
پر نکتہ چینی کی۔ اس کے علاوہ تعلیم کی عام اشاعت، شراب کے انسداد، غریب طبقے کی
فلاح و بہبود، کشمیر کی آزادی، یونانی و آیورویدک طریق علاج کی ہمت افزائی اور تعمیر قوم
کے دوسرے شعبوں پر اپنے فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا۔

عملی سیاسیات کی ان مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ علامہ کی علمی سرگرمیاں بھی
جاری تھیں۔ ۸ اپریل ۱۹۲۸ء کو آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ
میں فلسفہ اسلام کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔ اس سال اورینٹل کانفرنس
لاہور کے اجلاس میں مسلم سائنس دانوں کے گہرے مطالعہ کے موضوع پر آپ نے
صدارتی خطبہ دیا۔ اواخر دسمبر ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں

آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد براستہ بمبئی جنوبی ہند کے سفر پر روانہ ہوئے

مدراس میسور اور حیدر آباد کا سفر

مدراس مسلم ایسوسی ایشن کے بانی سیٹھ محمد جمال کی دعوت پر علامہ اوائل جنوری ۱۹۲۹ء میں مدراس پہنچے۔ وہاں آپ نے گوکھلے ہال میں تین عالمانہ لیکچر دیئے۔ یہی تین لیکچر بنگلور، میسور اور حیدر آباد کی یونیورسٹیوں کے اصرار پر وہاں بھی دیئے۔ ۷۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو انجمن خواتین اسلام مدراس کے سپاسنامہ کے جواب میں علامہ نے شریعت اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ کے موضوع پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ ابتدا میں آپ نے فرمایا: ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اگر میری تحریروں نے خواتین کے دلوں میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا ہے تو رب کعبہ کی قسم میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔" مدراس سے علامہ سر مرزا اسماعیل کی دعوت پر بنگلور پہنچے مسلم لائبریری کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ بنگلور یونیورسٹی کی فرمائش پر آپ نے مدراس کے لیکچر یہاں بھی دیئے۔ ۱۰۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو مہاراجہ میسور کی دعوت پر آپ میسور گئے میسور یونیورسٹی میں آپ کے لیے اعزازی جلسہ ہوا۔ وہاں آپ نے ایک لیکچر بھی دیا۔ اسی موقعہ پر وہاں فلسفہ کے ایک ہندو پروفیسر نے کہا: "ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں۔ بلکہ وہ ہم سب کے ہیں وہ کسی ایک مذہب اور جماعت کی ملکیت نہیں۔"

۱۱۔ جنوری کو میسور کے مسلمانوں کے وفد سے ملاقات کی اس کے بعد علامہ نے سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مزارات پر حاضری دی ٹیپو کے مزار پر میسور کے

ایک شاعر نے سلطان شہید کی تعریف میں ایک نظم سنائی جسے سن کر علامہ اتنے متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ بعد کو علامہ نے اپنے سفر میسور کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

"میسور میں، میں جہاں کہیں بھی گیا لوگوں کی زبان پر ایک ہی نام تھا، اور وہ سلطان شہید کا نام تھا۔"

میسور سے آپ نظام حیدرآباد کی دعوت پر ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد پہنچے۔ حیدرآباد اسٹیشن پر مسلمان بچوں اور بچیوں نے ترانۂ ملی "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" گا کر علامہ کا استقبال کیا۔ حیدرآباد میں آپ تین چار دن رہے اس دوران میں حیدرآباد یونیورسٹی کے زیر اہتمام مہاراجہ سرکشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کی صدارت میں آپ نے تین لیکچر بھی دیئے۔ ۱۸ جنوری کو علامہ نے نظام حیدرآباد سے ملاقات کی اور انہیں اس موقع پر فارسی کی ایک نظم سنائی اور رموز بیخودی کا ایک نسخہ بھی تحفۃً پیش کیا۔ نظام کے پاس ایک بیش قیمت ہیرا شب چراغ تھا۔ آپ نے اسے بطور خاص منگوا کر دیکھا اور اس کی چمک دمک کی تعریف کی۔

علامہ کا جنوبی ہند کا سفر ہر لحاظ سے کامیاب رہا تھا۔ ان کے علم و فضل کے چرچے بہت ہوئے اور دُور دُور ہوئے۔ جنوبی ہند کے انتہائی دور افتادہ علاقوں میں اُنہیں اپنی مقبولیت دیکھ کر یقیناً مسرت ہوئی ہوگی۔ خصوصاً اس لیے کہ اقبال کی مقبولیت دراصل اسلامی طرز فکر کی مقبولیت تھی۔

اپریل ۱۹۲۹ء میں علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں 'قرآن کا مطالعہ' کے عنوان سے جامع تقریر کی اَب کئی سال سے وہ انجمن کے جلسوں میں نظمیں سُنانے کے

بجائے۔ اہم اسلامی موضوعات پر تقریریں کرتے تھے۔ مدراس کے لیکچرز کی شہرت اور مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اس سلسلہ موضوعات کے باقی تین لیکچر چند مہینے میں تیار کیے اور نومبر ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دیتے۔ اگلے سال ۱۹۳۰ء میں یہ چھ خطبات 'اسلامی الہیات کی تشکیل جدید' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ خطبات فکر اقبال کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ایران کا فلسفہ مابعد الطبیعیات ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انگریزی نثر میں ان کی یہ پہلی وقیع فلسفیانہ کاوش تھی، جس سے ان کا مرتبہ بحیثیت ایک اسلامی مفکر اور فلسفی کے دنیائے علم میں مسلم ہو گیا

والد کی رحلت

علامہ کے والد ماجد طویل عمر پا کر ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں وفات پا گئے۔ اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھے کہ انہوں نے اقبال کی پیدائش سے قبل جو خواب دیکھا تھا اُسے اپنی زندگی میں سچا ہوتے دیکھا۔ خواب کی یہ تعبیر کی گئی تھی کہ ان کا ہونے والا فرزند خدمت اسلام میں ناموری پائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شیخ نور محمد صاحب ان پڑھ فلسفی کے لقب سے مشہور تھے اور صاحب کشف صوفی تھے۔ عشق رسول میں سرشار اور صوفیا و فقراء سے عقیدت رکھتے تھے۔ قادری سلسلہ میں بیعت تھے۔ اقبال نے تصوف کا ذوق، عشق رسول، درویشی، صوفیا، فقراء سے ارادت والد ہی سے ورثے میں پائی تھی۔ والد گرامی ہی کے ایماء پر انہوں نے فارسی کی مثنوی اسرار خودی لکھنی شروع کی تھی۔

خطبہ الہ آباد: علامہ چند سال سے عملی سیاست میں سرگرم کار تھے۔ وہ ہمیشہ سے

مسلمانوں کی علیحدہ قومیت اور جداگانہ حق انتخاب کے حامی تھے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کانفرنس میں اسی نقطہ نظر کی حمایت ہوئی تھی۔ تمام مسلمانان ہند کو ان کی سیاسی فراست و خدمات کا اعتراف تھا چنانچہ مسلم لیگ کے اُس تاریخی اجلاس کی صدارت کے لیے انہیں منتخب کیا گیا جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد کے مقام پر ہونے والا تھا اور علامہ نے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اَب تاریخ بن گیا ہے۔ اسی تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں پاکستان بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ انہوں نے فرمایا:۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا باہر رہ کر۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔" علامہ کو یہ امتیاز حاصل ہے اور یہ ان کی سیاسی فراست کا اعجاز تھا کہ ۱۹۲۶ء سے کر جب انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا تادم آخر وہ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت اور جداگانہ حق انتخاب کے اصول کے حامی رہے اس راہ میں بعض بڑے مشکل مقام آئے۔ یہاں تک کہ بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے لیکن اقبال بہر صورت اور بہر حال اپنے سوچے سمجھے مؤقف پہ قائم رہے۔ اسی اصول کی خاطر انہوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ مسٹر جناح سے اختلاف کرتے ہوتے سائمن کمیشن سے تعاون کیا۔ علیحدہ لیگ بنائی پھر اسی سال آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلانے کا اہتمام کیا اور دونوں لیگوں کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے کوشش کی ان تمام اقدامات کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنی علیحدہ اور جداگانہ ملی ہستی کو محفوظ کرنے کے لیے متحد ہو جائیں۔ ۱۹۳۰ء کا خطبہ اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھی جس میں پاکستان کا نصب العین پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۳۰ء کے بعد ملکی سیاست ایسے موڑ پر آگئی تھی کہ مسلم قومی مفادات کا تحفظ میدان عمل ہی میں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۳۰ء میں علامہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۰ء کو انہوں نے باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک بڑے جلسہ کی صدارت کی جو جداگانہ طریق انتخاب کی حمایت میں منعقد ہوا تھا۔ ۹ مئی کو وہ بھوپال گئے۔ وہاں مسلم اکابر کے ایک اجلاس میں شرکت کی اور نواب حمید اللہ خان سے ملک کی سیاسی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں وہ مغل پورہ انجینئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کے اسلام دشمن رویے کے خلاف ایک تحریک کی رہنمائی کرتے رہے اور موچی دروازہ کے جلسوں میں میں تقریریں کیں۔ اس دوران انہیں لندن میں منعقد ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کیا گیا۔ یہ نامزدگی اتفاقی نہیں تھی۔ اس زمانے میں مسلم حقوق و مطالبات کے متعلق کوشش کرنے والے اور ہندوستان کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کی مستقل انفرادیت کی حفاظت کرنے والے لیڈروں میں علامہ اقبال سب سے زیادہ ممتاز تھے اور ملتِ اسلامی کی عظیم اکثریت ان کی ہم خیال و ہم آہنگ ہو چکی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے دوسرے مدعوئین میں سر آغا خان اور محمد علی جناح ، مولانا شوکت علی بھی شامل تھے۔

دوسری گول میز کانفرنس

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی تھی۔ اس دوران میں آپ کو اٹلی کی روم اکیڈمی کی طرف سے تقریر کرنے کی دعوت ملی۔ اور فلسطین کے مفتیٔ اعظم کی طرف سے بھی بیت المقدس فلسطین میں منعقد ہونے والی اتحاد اسلامی کی مجلس میں شرکت کی دعوت ملی۔ یہ اجلاس دسمبر ۳۱ء میں منعقد ہونا تھا۔ گول میز کانفرنس سے

فارغ ہونے کے بعد آپ روم ہوتے ہوتے فلسطین جا سکتے تھے۔ چنانچہ علامہ نے تینوں دعوت نامے قبول کر لیے اور سفر کی تیاری شروع کر دی۔

۸ راگست ۱۹۳۱ء کو علامہ لاہور سے روانہ ہوئے دوسرے دن دلی پہنچے اسٹیشن پر ہزاروں عقیدت مندوں نے نعرہ تکبیر کی تکرار میں آپ پر پھول برسائے۔ یہ لوگ آپ کو خدا حافظ کہنے آتے تھے۔ اسی پرجوش مجمع سے خطاب کرتے ہوتے علامہ نے فرمایا:

"میرے ساتھ نہ کوئی میرا پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر جس پر میں اپنے دلائل کی اساس قائم کر دوں۔ میرے ساتھ صرف حق و صداقت کی ایک جامع کتاب قرآن مجید ہے جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔"

آٹھ بجے آپ بمبئی روانہ ہو گئے۔ بمبئی میں آپ نے خلافت ہاؤس میں قیام کیا۔ اسی دن سہ پہر کو محترمہ عطیہ فیضی نے آپ کے اعزاز میں پارٹی دی۔ ۱۲ راگست کو آپ بمبئی سے ملوجانا جی جہاز کے ذریعہ انگلستان روانہ ہوئے۔ عدن کی بندرگاہ پر ساحل عرب کو دیکھ کر علامہ پر جذباتی کیفیت طاری ہو گئی۔ سرزمین عرب کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو، تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں کیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقوش قدم دیکھے ہیں کاش میرے گنہگار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے

صحراؤں میں لپٹ جاؤں اور دُنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا سکوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

۲۷ اگست ۱۹۳۱ء کو اقبال انگلستان پہنچے اور جیمز کورٹ میں ٹھہرائے گئے اس کے قریب ہی سینٹ جیمز تھا جہاں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ گول میز کانفرنس کے علاوہ اقبال کی دوسری علمی اور ملی مصروفیتیں بھی کم نہیں تھیں ووکنگ مسجد کے امام نے کانفرنس کے مسلمان مندوبین کے اعزاز میں جو استقبالیہ دیا اس میں اقبال بھی شریک ہوئے اس تقریب میں ایک انگریز نوجوان عبدالرحمٰن ہارڈی نے بہترین عربی لہجے میں تلاوت کی۔ ایک چھوٹی بچی نے سورۃ فاتحہ سُنائی علامہ نے خوش ہو کر اُسے ایک پاؤنڈ انعام دیا۔ ۱۶ اکتوبر کو ترکی کے غازی رؤف بے۔ اور سعید شامل نے ان سے ملاقات کی۔ ۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو علامہ نے انڈیا سوسائٹی میں فلسفہ شعر کے عنوان سے لیکچر دیا۔ یہ ایک علمی اور ادبی تنظیم تھی جس نے علامہ کو نائب صدر کا عہدہ پیش کیا اور آپ نے قبول بھی کر لیا۔ ۷ نومبر کو انگلستان میں مقیم مسلمان طلباء نے علامہ کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا اس تقریب میں سامعین کے اصرار پر آپ نے اپنے اشعار سُنائے۔ لندن میں قیام کے دوران علامہ کو کئی بار کیمبرج میں خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ آپ نے ۱۸ نومبر کا دن دیا تھا۔ چوہدری رحمت علی (جو اس وقت کیمبرج میں زیر تعلیم تھے) کیمبرج میں علامہ کے استقبال میں پیش پیش تھے۔ شام کو پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں آپ نے ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات کی اور آخر میں ایک پُر مغز فاضلانہ تقریر کی۔ کانفرنس کے دوران لندن کی اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے اقبال کے اعزاز میں مشہور والڈروف

ہوٹل میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جس میں انگلستان کی ممتاز علمی و سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ کھانے کے بعد کی تقریب میں، سر عبدالقادر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

"آج ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ سرزمینِ مشرق کا سب سے بڑا شاعر اور فلسفی ہمارے درمیان موجود ہے جس کے اعزاز میں ہم سب یہاں جمع ہوتے ہیں۔"

اس جلسہ میں "اسرار خودی" کے انگریزی مترجم پروفیسر نکلسن نے کہا: میں آج سے ۲۵ سال پہلے اقبال سے کیمبرج میں ملا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس نوجوان کے شاندار مستقبل اور آئندہ زندگی میں حاصل ہونے والی شہرت اور عزت کا اندازہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ وہ بڑے مرتبے کو پہنچیں گے اور نام پائیں گے۔ نکلسن کی تقریر کے بعد، سوسائٹی کے سیکرٹری نے سپاسنامہ پیش کیا۔ علامہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں مشہور شاعرہ سروجنی نائیڈو نے آپ کی تعریف میں ایک نہایت خوبصورت تقریر کی۔

گول میز کانفرنس کی دو کمیٹیاں تھیں ایک اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹی، دوسری وفاقی نظام پر غور کرنے والی کمیٹی۔ علامہ پہلی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اقلیتی امور پر گاندھی جی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس لیے علامہ وفاقی کمیٹی کی کارروائی میں حصہ لینے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وفاق کے خلاف تھے۔ وفاق میں ہندو اپنی اکثریت کی بنا پر مسلمانوں کو غلام بنا لیتے اور مسلمان بحیثیت قوم کے زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ شروع میں تو دوسرے مسلمان مندوبین نے علامہ کے فیصلے کی تائید کی لیکن بعد کو کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لینا شروع کر دیا اقبال کو ان کی اس منافقت پر بڑا صدمہ ہوا لیکن

خود دفاقی کمیٹی سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں علامہ کو اپنے چھوٹے بیٹے جاوید اقبال کا پہلا خط موصول ہُوا جس میں گراموفون لانے کی فرمائش کی گئی تھی۔ جس کے جواب میں انہوں نے وہ غزل لکھ بھیجی جس کا مطلع ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

روم کا سفر

۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء کو علامہ حکومت اٹلی کی دعوت پر پیرس کے راستہ روم روانہ ہُوئے ۲۲ نومبر کو روم پہنچے۔ سرکاری استقبال ہُوا سرکاری مہمان کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ہوٹل میں اٹلی کی بعض ممتاز شخصیتیں ملاقات کے لیے آئیں ۲۴ نومبر کو روم کے تاریخی مقامات کی سیر کی۔ اسی روز شام کو اٹلی کے مشہور عالم اور مستشرق پروفیسر جنٹلی سے طویل ملاقات کی۔ ۲۵ نومبر کو افغانستان کے غازی امان اللہ سے عالم اسلام کے مستقبل پر سیر حاصل بحث کی۔ ۲۶ نومبر علامہ نے روم کی رائل اکیڈیمی میں لیکچر دیا۔ جسے سامعین نے بہت سراہا۔ ۲۷ نومبر کو مسولینی سے اس کی خواہش پر ملاقات کی۔ علامہ اس کی تیز نگاہی با رعب شخصیت سے متاثر ہوتے اور وہ ان کے گہرے خیالات سے مستفید ہوا۔

مسولینی نے پوچھا: میری فاشسٹ تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ علامہ نے جواب دیا۔ "آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریہ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کا تابع ہو سکتا ہے" اس کے بعد اطالوی ڈوچے نے علامہ

سے ان کے قیامِ اٹلی کے تاثرات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا :

میں سمجھتا ہوں کہ اطالوی لوگ ایرانیوں سے کافی حد تک مشابہت رکھتے ہیں بڑے ذہین و فطین، خوب رُو اور فن پرست ہیں۔ ان کے پیچھے تمدن کی کتنی صدیاں ہیں مگر ان میں خون نہیں۔ اس پر مسولینی نے حیرت کا اظہار کیا تو آپ نے اپنے قول کی یوں وضاحت کی۔

"ایرانیوں کو ایک فائدہ میسر رہا ہے جو اطالویوں کو میسر نہیں اور وہ یہ کہ ان کے اردگرد مضبوط اور توانا قومیں، افغان، کُرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کر سکتے ہیں۔ اطالوی ایسا نہیں کر سکتے۔ اس پر مسولینی نے پوچھا۔ "اچھا ہم اطالویوں کو کیا کرنا چاہیے۔ علامہ نے جواب دیا "یورپ کی تقلید سے منہ موڑ کر مشرق کا رُخ کر و۔ اس لیے کہ یورپ کا اخلاق زوال آمادہ ہے۔ مشرق کی ہوا تازہ ہے۔ اس میں سانس لو۔"

مسولینی نے حکیم مشرق سے کوئی اچھوتا مشورہ طلب کیا۔ تو انہوں نے فرمایا :۔

ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اُسے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دو اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔ مسولینی نے اس کی وجہ پوچھی تو علامہ نے کہا :

شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی بھی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکات شر لے لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا کہ یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ میرے پیغمبر نے آج سے تیرہ سو سال پہلے یہ مصلحت آمیز ہدایت جاری فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد کرنے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے"۔ یہ حدیث سنتے ہی مسولینی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ میز پر مارتے ہوئے بولا۔

(WHAT A WONDERFUL IDEA)

کتنا خوبصورت اور انوکھا خیال ہے۔

مسولینی سے علامہ کی ملاقات کوئی چالیس منٹ جاری رہی۔ہال سے باہر نکل کر صحافیوں کے اصرار پر آپ نے کہا:

"آپ کا ذوپچے بغیر بائیبل کے لوتھر ہے"۔

علامہ نے اس ملاقات پر مبنی ایک نظم بھی لکھی جس کا مصرعہ ہے ؎

وہ کہ ہے جسکی نگہ مثل شعاعِ آفتاب

لیکن ایک دوسری نظم میں اس کی ہوس ملک گیری پر سخت تنقید بھی کی ہے۔

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ

روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش

ایک اعتراض کے جواب میں کہ آپ نے مسولینی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں آپ نے لکھا:

اگر اس بندۂ خدا میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے؟ روم میں علامہ چھ سات روز رہے اس دوران اٹلی کے بڑے بڑے عالم اور فاضل اور مقتدر لوگ ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ۲۷ نومبر کو ایک دعوت کے بعد روم کے آثار قدیمہ دیکھتے ہوتے ایک ماہر نے انہیں بتایا کہ روم کے ان اکھاڑوں میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت تماشا دیکھ سکتے تھے علامہ اس سے بڑے متاثر ہوتے رات کو جب واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو اپنے رفیق سفر مولانا غلام رسول مہر سے کہنے لگے:

ایک طرف قدیم رومی سلطان تھے جنہوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض کے لیے بنائی کہ پچاس ہزار انسان بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا تماشا دیکھیں دوسری طرف لاہور کی بادشاہی مسجد ہے جو اس غرض کے لیے تعمیر کی گئی ہے کہ ایک لاکھ بندگانِ خدا مساوات، اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کتنی برکات کا سرچشمہ ہے۔

۲۸ نومبر کی شب کو روم سے مصر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے آپ نیپلز گئے پومپئی کے کھنڈرات کی سیر کی اور عجائب گھر دیکھا۔

اقبال مصر میں

۲۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو اسکندریہ مصر پہنچے۔ یہاں جمعیۃ المسلمین کے پرجوش ارکان نے آپ کی پذیرائی کی۔ یہاں سے قاہرہ کا رُخ کیا۔ یہاں بھی شاندار استقبال ہوا اور سب سے اچھے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ مصری اخبار نویسوں کے اصرار پر "شبان مصر" کے نام سے یہ مختصر پیغام جاری کیا:

"مصر کے نوجوانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وفادار رہیں"۔

دوسرے دن آپ اہرام دیکھنے گئے۔ قاہرہ کے قیام کا زیادہ وقت علماء و فضلاء سے ملاقاتوں میں صرف ہوا۔ مصر کے بزرگ عالم سید قاضی ابوالعزائم مع اپنے دو بیٹوں کے ان سے ملنے کے لیے آئے۔ علامہ نے کہا: آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آپ کی زیارت کے لیے آپ کے پاس چل کر آتا۔ سید صاحب فرمانے لگے خواجہ دو جہاں حضور صلعم

کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی" یہ بات سن کر علامہ بے چین ہو گئے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد روتے ہوئے فرمانے لگے :

ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گنہگار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاں کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودی آنحضرت ملنے آتے ہیں"۔

مصر میں آپ کی ملاقات مشہور تاریخ دان اور صحافی ڈاکٹر محمد حسین ہیکل سے بھی ہوئی ۴۔ دسمبر کی شام کو آپ نے شبان المسلمین کے دفتر میں انگریزی میں تقریر کی۔ اجلاس کے اختتام پر انجمن کی طرف سے چند کتابیں تحفتہً پیش کی گئیں۔ اسی روز آپ نے مصر کی مشہور شخصیت محمد علی پاشا سے ملاقات کی۔ ۵۔ دسمبر کو مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔ سب سے پہلے مسجد عمرو بن العاص گئے۔ فسطاط کا شہر دیکھا امام شافعی کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں فاتحہ کے بعد آپ دیر تک تلاوتِ قرآنِ پاک کرتے رہے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ جامعۂ ازہر پہنچے اور کچھ دیر منطق، تفسیر اور حدیث کے درس میں شریک رہے جامعۂ ازہر کی طرف سے بھی آپ کو چند کتابیں نذر کی گئیں۔ مصر میں آٹھ دن گزارنے کے بعد آپ ٹرین سے فلسطین روانہ ہوئے۔ قاہرہ سے آپ کو بڑی گرم جوشی سے الوداع کیا گیا اور پھولوں کے گلدستے پیش کیے گئے۔

فلسطین میں موتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت

موتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے علامہ مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ ۶۔ دسمبر کی صبح کو قاہرہ سے بیت المقدس پہنچے۔ آپ کے استقبال کے لیے خود مفتیٔ اعظم

امین الحسینی نے تکلیف کی تھی اور غیر معمولی اہتمام سے آپ کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

۷، دسمبر کو مؤتمر کا افتتاحی اجلاس ہُوا جس میں ترکی اور افغانستان کے سوا دُنیا کے ہر اسلامی ملک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کے تمام عشر کا مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں علامہ نے محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ مسجد اقصیٰ میں نماز مغرب ادا کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد مفتی اعظم امین الحسینی نے اپنا خطبہ پڑھا۔ ان کے بعد علامہ نے تقریر کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر سعید نے مندوبین سے درخواست کی کہ وہ کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ عہد کریں کہ وہ مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی قربانی سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ تمام مندوبین نے کھڑے ہو کر یہ عہد کیا اس کے بعد دیر تک اللہ اکبر کے نعرے گونجتے رہے۔

دوسرے اجلاس میں عہدیداران کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ مفتی اعظم صدر منتخب ہوئے اور چار نائب صدر چنے گئے جن میں سے ایک علامہ بھی تھے۔ مؤتمر کے اجلاس میں مختلف مسائل کے حل کے لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ان میں سے بیشتر کے علامہ رکن تھے۔ ایک کمیٹی کے سامنے علامہ نے یہ رائے پیش کی کہ بیت المقدس میں جامعہ ازہر کے قدیم طرز کی نہیں بلکہ بالکل جدید طرز کی اسلامی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مؤتمر کے اختتامی اجلاس میں علامہ نے ایک پُر فکر اور ولولہ انگیز تقریر کی۔ اجلاس کے بعد علامہ نے دارالاتیامی القدس دیکھا اس ادارے کے ڈائریکٹر نے مصر کا مطبوعہ ایک نہایت خوبصورت قرآن مجید آپ کو تحفتہً نذر کیا۔ علامہ نے یہاں پانچ پاؤنڈ یتیموں کی امداد کے لیے دیئے۔ فلسطین کے قیام کے دوران آپ مقامات مقدسہ کی سیر کرتے رہے۔ بیت اللحم، الخلیل اور یافہ بھی دیکھا۔ فلسطین میں آٹھ روز ٹھہرنے کے بعد ۱۵، دسمبر کو وہاں سے پورٹ سعید روانہ ہوئے۔ واپسی پر کچھ دیر عدن ٹھہرے اور چند دنوں کے بعد بمبئی پہنچ گئے۔

بمبئی میں عطیہ فیضی نے ایوان رفعت میں اقبال کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا تھا
اس دعوت سے فارغ ہو کر اسی شام دلی روانہ ہو گئے۔ دلی پہنچنے پر آپ کو سپاسنامہ پیش کیا
گیا اور پر جوش استقبال ہوا۔ راستے میں لدھیانے ریلوے اسٹیشن پر خیر مقدم کا انتظام تھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء
کو آپ تقریباً تین ماہ کے بعد واپس لاہور پہنچے۔ یہاں بھی پر جوش بلکہ پر خروش پذیرائی کا اہتمام
تھا۔ عوام و خواص، علامہ کی گول میز کانفرنس اور عالم اسلام کی خدمات کے لیے سراپا سپاس تھے۔

خطبہ لاہور

دوسری گول میز کانفرنس کسی واضح نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تھی۔ علامہ کانفرنس میں
مسلم مندوبین کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔ چونکہ مندوبین کا زاویہ وفاق کے مسئلہ پر واضح
اور محکم نہیں تھا لیکن انہیں اصل تشویش ہندوؤں کے عدم مصالحانہ بلکہ جارحانہ رویے سے
تھی۔ ان کی سیاسی فراست کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حکومت اب ہر قیمت پر کچھ آئینی اصلاحات
کا اعلان کرنے والی ہے۔ اقلیتی میثاق کی روشنی میں فرقہ وارانہ فیصلہ جلد صادر ہونے کی
توقع بھی تھی۔ ان حالات میں ضرورت تھی کہ ایک بار مسلمانوں کے نقطہ نظر کو قوت سے
بیان کیا جائے اور متوقع آئینی اصلاحات کی روشنی میں لائحہ عمل بھی مرتب کیا جائے۔ اس
مقصد کے لیے آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو اس وقت کی واحد فعال مسلم سیاسی جماعت
تھی۔ اپنا سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ علامہ کو اس اجلاس کی صدارت
کے لیے منتخب کیا گیا۔ موچی دروازہ کے باہر ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں
علامہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی پر زور دیتے ہوئے کہا۔

یہ آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے جو ممکن ہے کہ تمام ہندوستان پر بلکہ سارے

ایشیا پر چھا جائے۔ اس کے بعد علامہ نے گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم سمجھوتے کے متعلق ہونے والی کوششوں کی تفصیلات بیان کیں۔ آگے چل کر آپ نے برطانوی وزیر اعظم کے گول میز کانفرنس میں اس اعلان پر اظہار تشویش کیا کہ وہ صوبائی خود مختاری اور وفاقی حکومت کو بیک وقت نافذ کرنا چاہتے ہیں اور فرقہ وارانہ فیصلہ صادر کرنے میں دیر کرنے پر حکومت پر سخت نکتہ چینی کی۔

آپ نے نہایت پر زور الفاظ میں حکومت پر واضح کیا کہ مسلمان مندرجہ ذیل مطالبات سے کم پر کسی طرح رضامند نہ ہوں گے:

۱۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی اکثریت کو کسی صورت میں اقلیت میں نہ بدلا جائے۔

۲۔ جداگانہ انتخاب بہر حال برقرار رکھے جائیں۔

۳۔ مکمل صوبائی خود مختاری دی جائے۔ وفاق کے ہر جز کی مساویانہ حیثیت ہو۔

۴۔ صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۵۔ سندھ کو غیر مشروط طور پر ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

۶۔ مرکز میں مسلمانوں کو تہائی نشستیں دی جائیں۔

یہ مطالبات بنیادی طور پر وہی تھے جن پر آل پارٹیز مسلم کانفرنس اتفاق کر چکی تھی اور جو جناح کے ۱۴ نکات میں شامل تھے۔ اس خطبہ کی خصوصی اہمیت اور انفرادیت ان مدبرانہ اور ناصحانہ نکات میں بھی ہے جو علامہ نے قوم کے سامنے پیش کیے۔ آپ نے فرمایا:

۱۔ کسی فریق سے توقعات وابستہ نہ کرو اگر تم اپنی تمناؤں کو بار آور ہوتے دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی خودی کو اپنے اندر بیدار کرو اور اپنی خاک نمناک کو پختہ کر کے اسی سے اپنے

میں جوہر مردانگی پیدا کرد۔ سخت بن جاؤ اور سخت کوشی اختیار کرو۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں کامیابی کا یہی ایک راز ہے۔ آئندہ دستور میں اسلام کے لیے ایک ایسے مؤقف کو کامیابی سے حاصل کرنا ہمارا مطمع نظر ہے جس سے ایسے مواقع حاصل ہو جائیں کہ اسلام اپنے مقاصد کو اس ملک میں پھلتا پھولتا دیکھے۔ یہ ضروری ہے کہ اس نصب العین کی روشنی میں جماعت کی ترقی پسند طاقتوں کو ابھارا جائے اور ان کی موجودہ افسردہ توانائیوں کو مجتمع کیا جائے۔ زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ اس کو اپنی ہی روح کے شوالہ میں فیروزاں کرنا چاہیے۔ اس کے لیے سرگرم تیاری اور ایک مستقل لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو میں سمجھتا ہوں جزواً سیاسی اور جزواً ثقافتی ہونا چاہیے۔

اس کے بعد علامہ نے حسب ذیل لائحہ عمل مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

۱۔ مسلمانانِ ہند کا ایک ہی وسیع بنیادوں پر مبنی سیاسی ادارہ ہو۔

۲۔ اس مرکزی ادارے کے تحت ۵۰ لاکھ روپے کا ایک قومی فنڈ قائم کیا جائے۔

۳۔ نوجوانوں کی ایک رضاکار جماعت تیار کی جائے جو دیہات میں معاشرتی اور معاشی سدھار کا کام کرے۔

۴۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو اسلامی تعلیمات کو پھیلائیں ان اداروں کا سیاسیات سے تعلق نہ ہو۔

۵۔ ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں علماء اور مسلم وکلاء جنھوں نے جدید اصول قانون کی تعلیم پائی ہو، شامل کیے جائیں۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہو کہ حالات حاضرہ کی روشنی میں قانون کے بنیادی اصولوں اور اس کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا تحفظ، اس کی توسیع اور ضرورت ہو تو اس کی ازسرنو تعمیر کرے اس مجلس کو ملک

کے دستور میں تسلیم کیا جائے تاکہ کوئی مسودۂ قانون جس کا اثر مسلمانوں کے شخصی قانون پر پڑتا ہو اس وقت تک قانون ساز اسمبلی میں پیش نہ ہو جب تک اس مسودہ کو اس مجلس کی منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ اس مخصوص عملی مقصد کے علاوہ اس مجلس کے قیام کے باعث تمام دُنیا کے باشندوں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اسلامی قانون کی وسعت، سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں اس کی افادیت اور موجودہ بحران میں اس کی قدر و قیمت سے بہتر طریقہ پر واقف اور مستفید ہو سکیں گے۔

اس خطبہ کے نکات اب بھی پاکستان کے لیے رہنما اصولوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ خطبہ اپنی معنویت و بصیرت کے لحاظ سے ان کے خطبہ الہ آباد سے کم نہیں ہے۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۷، اگست کو دہلی میں ہوا۔ علامہ نے صدارت فرمائی۔ اس اجلاس میں حکومت برطانیہ سے فرقہ وارانہ فیصلہ جلد صادر کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات منظور نہ ہونے کی صورت میں آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل کی گئی۔ ۱۶، اگست کے اس متوقع فیصلہ کا اعلان ہونے پر ۲۲، اگست کو علامہ کی صدارت میں مجلس عاملہ کا اجلاس پھر منعقد ہوا اور اس فیصلہ پر ایک قرارداد منظور کی گئی۔ جس کی حمایت میں ۲۴، اگست کو علامہ نے اہم اخباری بیان جاری کیا اور فرقہ وارانہ فیصلہ کی خامیوں اور ناانصافیوں کی نشاندہی کی۔

برطانوی ہند کے مسلمانوں کے مفادات کی آئینی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ علامہ اور محاذ پر بھی برسرپیکار تھے۔ کشمیر کی مسلم اکثریت پر ڈوگرا مہاراجہ کے مظالم نے ۱۹۳۰ء سے نئی شدت اختیار کر لی تھی اور ان کے خلاف پنجاب کے مسلمان خاص طور سے عملی اور سیاسی احتجاج کر رہے تھے۔ علامہ کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے اور آئینی ذرائع سے

کشمیری مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ علامہ نے نواب بھوپال حمید اللہ خان کے ذریعہ سے بھی مہاراجہ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ پر مہاراجہ نے گلینسی کمیشن قائم کیا تاکہ مسلمانوں کی شکایت کا جائزہ لے کر ان کا ازالہ کیا جائے علامہ اس کمیشن کی تشکیل سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم کانفرنس نے علامہ کی صدارت میں کشمیری مسلمانوں کے مسئلہ پر بھی قرارداد منظور کر لی۔ اس طرح ریاست الور کے مسلمانوں پر جو مظالم ہو رہے تھے ان پر کانفرنس کے ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کے اجلاس میں غور ہوا ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ۸ جون ۱۹۳۲ء کو پھر اس مسئلہ پر غور کیا گیا اور وائسرائے کو یادداشت بھیجی گئی جس کے نتیجہ میں مہاراجہ الور برطرف کر دیئے گئے۔

مولانا عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں لکھتے ہیں :

اس پر آشوب زمانے میں جب مسلمانانِ ہند کی سیاست ایک انقلابی موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ اس نازک موقع پر مسلمانان ہند کی رہنمائی کا فرض صرف علامہ اقبال نے انجام دیا۔ پورے ملک میں کوئی ایسا مسئلہ جو مسلمانوں کی حیاتِ سیاسی سے متعلق تھا ان کی توجہ اور کوشش سے محروم نہ تھا۔ مسلم لیگ بالکل بے روح تھی۔ مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے انتشار سے تنگ آ کر انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ خلافت کمیٹی بھی افسردہ بلکہ مردہ ہو چکی تھی۔ مخلوط انتخاب کے حامی قوم پرست اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر گھروں میں بیٹھے ہندوؤں کی ضد اور احسان فراموشی کا مرثیہ پڑھ رہے تھے اور اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی پوری سیاست کے جہاز کا ناخدا بنا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنی مساعی میں کامیاب ہوئے جداگانہ انتخاب کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔ فرقہ وارانہ فیصلہ زیادہ تر مسلمانوں کے منشا کے مطابق صادر ہوا۔ کشمیر، الور وغیرہ

کے مسائل بھی بڑی حد تک حل ہوتے"۔ وہ اقبال جن کے بارے میں مشہور تھا کہ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد ان دنوں سراپا حرکت بنے ہوئے تھے سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ثقافتی و علمی مصروفیتیں بھی جاری تھیں۔

علامہ کی معرکتہ الآرا فارسی کتاب جاوید نامہ فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ یکم مارچ ۱۹۳۲ء کو ٹاؤن ہال لاہور کے باغ میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک استقبالیے میں شریک ہوتے اسی انسٹی ٹیوٹ نے ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو یوم اقبال منایا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو جالندھر میں عید میلاد النبی کے جلسہ میں سیرت النبی کے حقائق و معارف پر ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ اگست ۱۹۳۲ء میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ۱۹۳۲ء ہی میں جامعہ ملیہ دہلی میں غازی رؤف پاشا کے دو لیکچروں کی صدارت کی۔ روایت ہے کہ شام کے وقت جب علامہ، ڈاکٹر انصاری اور رؤف پاشا کے ساتھ جامعہ کے ہال میں داخل ہونے لگے تو غازی رک گئے اور حضرت علامہ سے کہا آپ ہمارے متقدم و پیشوا ہیں۔ آپ آگے چلئے۔ رؤف پاشا کی تقریر کے بعد علامہ نے بھی ایک بصیرت افروز خطبے میں اتحاد اسلامی کے نصب العین کی اہمیت واضح کی۔ دوسرے دن پھر علامہ ہی نے صدارت کی۔ لوگ متوقع تھے کہ آج پھر فصیح و بلیغ خطبہ سننے میں آئے گا۔ لیکن علامہ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر بیٹھ گئے۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے۔ بیکاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا: آج کل مجھے بالکل فرصت ہے اس لیے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔

لندن کی ارسٹاٹلین سوسائٹی نے علامہ سے استدعا کی تھی کہ کسی وقت ہمارے ہاں تشریف لاکر کسی فلسفیانہ موضوع پر لیکچر دیجئے۔ علامہ نے مئی ۱۹۳۲ء میں ایک لیکچر لکھا اس کا عنوان تھا۔ کیا مذہب ممکن ہے۔ بعد کو یہ لیکچر انگلستان میں دیا گیا۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت

علامہ کی یہ سیاسی اور ثقافتی مصروفیتیں جاری تھیں کہ انہیں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اس کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ کانفرنس ۱۷ نومبر کو شروع ہونا تھی۔ لیکن وہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو روانہ ہو گئے تاکہ فرانس وغیرہ میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملے۔ لاہور سے روانہ ہونے سے قبل آپ نے اخبارات کو یہ بیان دیا: "لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس نہایت اہم ہوگا۔ فرقہ وارانہ فیصلہ نے ہمارے راستے سے بہت سی مشکلات دور کر دی ہیں اب ہمارا فرض ہے کہ باقی فیصلہ طلب مسائل کا مناسب حل دریافت کریں۔ میں مسلمانان ہند اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی قوت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کرے گا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس حکمت عملی پر سختی سے کاربند رہیں جس کا اظہار مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں میں کیا جا چکا ہے۔ میں اس سے بہتر کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کا بیان کردہ یہ اصول یاد دلادوں کہ

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ"

لندن جاتے ہوئے علامہ چند دن پیرس میں ٹھہرے بڑے شوق سے نپولین کے مقبرے پر گئے۔ یہاں دس منٹ تک ٹھہرے علامہ نپولین کی جرأت اور تب

عمل سے متاثر تھے۔ انہوں نے نپولین پر ایک نظم بھی لکھی۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

مشہور ریسرچ اسکالر میگ نون (جس نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ دانتے کی کتاب طربیۂ خداوندی اسلامی حکایات سے ماخوذ ہے) سے ان کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس نے علامہ کو یونیورسٹی میں ایک لیکچر دینے کی دعوت بھی دی جسے انہوں نے آئندہ کے لیے قبول کر لیا۔ علامہ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ معروف فرانسیسی فلسفی پروفیسر برگساں سے بھی ملیں لیکن وہ پیرس کے مضافات میں آباد تھے جہاں جانے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے بذریعہ ٹرین لندن روانہ ہو گئے۔ ٹرین میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جس ڈبے میں آپ سفر کر رہے تھے اس میں دو نوسرباز جواری بھی سفر کر رہے تھے۔ جنہوں نے دیکھتے دیکھتے سادہ لوح مسافروں سے تاش کے کھیل میں ۲۰ پونڈ کی رقم ہتھیالی۔ علامہ ان کی چالوں کو بغور دیکھتے رہے۔ جب جواریوں نے آپ کو بھی بازی لگانے کی دعوت دی تو آپ نے قبول کر لی اور لندن پہنچتے پہنچتے بیس پونڈ جیت لیے جب گاڑی سے نیچے اُترے تو دونوں اپنی غریبی کا واسطہ دے کر خوشامد کرنے لگے اور انہوں نے ہندوستانیوں کی سخاوت کے پل باندھے۔ جب علامہ نے دھمکی دی کہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔ تم کھیل میں دھوکا کرتے ہو تو وہ فوراً نو دو گیارہ ہو گئے۔

تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۴ دسمبر تک جاری رہی۔ کانفرنس میں زیادہ تر ہندوستان کے آئینی معاملات مثلاً رائے دہی، کمیٹیوں کا تقرر، ریاستوں کے امور پر تحقیقاتی کمیٹی کا قیام، وفاقی مالیاتی کمیٹی کا تقرر وغیرہ پر بحث

ہوتی رہی اس کانفرنس میں ہندوؤں نے عدم مفاہمت کی پالیسی قائم رکھی۔ علامہ نے وفاق ہند کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر شروع ہی میں ظاہر کر دیا کہ ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاق ہی ہو) قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبے کو آزاد ڈومینین بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کی بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو" علامہ کے اس خیال کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی اس اصولی اختلاف کی وجہ سے علامہ نے کانفرنس میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ نجی محفلوں میں ضرور اپنی اسلامی ہند کی تجویز پر گفتگو کرتے رہے۔ چوہدری رحمت علی کی پاکستان نیشنل کانگرس کا لٹریچر مندوبین میں تقسیم ہو ہی رہا تھا۔ بعض اہل نظر علامہ کی تجویز سے متفق بھی ہونے لگے تھے۔ چار پانچ سال بعد علامہ نے قائداعظم کو ایک خط میں لکھا:

مجھے یاد ہے انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ "ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل تمہاری سکیم میں ہے لیکن اس کے بار آور ہونے میں ابھی پچیس سال کی مدت درکار ہے"۔ لندن میں ایک نیشنل لیگ قائم تھی جس کا مقصد عالم اسلامی میں دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا اس نے علامہ کے اعزاز میں ۲۵، نومبر کو ایک استقبالیہ دیا جس میں معتدد انگریز، اور کانفرنس کے ہندو مسلم مندوبین شریک ہوئے۔ علامہ نے اپنی تقریر میں گول میز کانفرنس کے مسائل پر اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ اگر برطانیہ نے ہندوستان پر اعتماد کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ پر اعتماد کر رہا ہے۔ علامہ نے ۲۲، نومبر کو علیحدگی سندھ کے متعلق ایک یادداشت پارلیمنٹ کے سب ممبروں کو ارسال کی۔ ۱۵، دسمبر ۱۹۳۲ء کو دارالعلوم میں ایک تاریخی جلسہ ہوا

جس میں علامہ اقبال کا استقبال کیا گیا۔ علامہ نے اپنی عالمانہ تقریر میں مسلمانوں کے بنیادی مطالبات کو وضاحت سے بیان کیا۔

برگساں سے ملاقات

کانفرنس سے فارغ ہو کر علامہ نے پیرس کا رُخ کیا اور برگساں سے طویل ملاقات کی۔ نظریہ زماں و مکاں زیر بحث آیا۔ دوران گفتگو جب آپ نے برگساں کو یہ حدیث سُنائی کہ "زمانہ کو بُرا مت کہو زمانہ خود خُدا ہے" تو وہ چونک پڑا۔ بار بار پوچھتا تھا کیا یہ واقعی حدیث ہے۔ برگساں سے علامہ کی دلچسپی اس وجہ سے تھی کہ وہ اس کے نظریہ واقعیت زمان کو اسلامی تصور کے بہت قریب سمجھتے تھے۔

اقبال اسپین میں

پیرس سے علامہ اسپین گئے۔ اس سفر کا زادِ راہ نواب حمید اللہ خان والی بھوپال نے مہیا کیا تھا اور انتظام پرائیویٹ سیکرٹری نے۔ اسپین میں علامہ کی دلچسپی کا مرکز مسجد قرطبہ تھی۔ وہ وہاں اذان بھی دینا چاہتے تھے اور نماز پڑھنا بھی۔ یہ دونوں چیزیں قانوناً ممنوع تھیں۔ بہر حال خُدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ آپ نے وہاں اذان بھی دی اور نماز بھی پڑھی۔ سات سو سال کے طویل عرصے کے بعد یہ پہلی اذان تھی جو مسجد کے در و دیوار سے بلند ہُوئی۔ نماز کے دوران آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ گریہ زاری سے بیہوش ہو گئے۔ بعد میں اقبال نے بتایا کہ اسی عالم میں ایک بزرگ ان کے پاس تشریف لائے اور مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

اقبال تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔

جب آپ ہوش میں آتے تو آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ رہے تھے اور دل کو اطمینان و سکون حاصل ہو چکا تھا۔ جب آپ نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ تو یکایک اشعار کا نزول ہونے لگا حتیٰ کہ پوری دُعا اشعار کی شکل میں مانگی۔ اس کا شعر ہے

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

مسجد قرطبہ کے جلال و جمال نے اقبال کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اس روحانی تاثر و تجربے سے وہ لافانی نظم تخلیق ہوئی جو مسجد قرطبہ کے عنوان سے بال جبریل میں شائع ہوئی اور جو علامہ کی پوری اُردو شاعری کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ فکر کے لحاظ سے بھی اور فن کے اعتبار سے بھی وادالکبیر (اسپین کا دریا جس کے کنارے مسجد قرطبہ واقع ہے) کے کنارے اقبال بیٹھ کر اقبال نے کرۂ ارض پر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھتے ہوئے لکھا:

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

اسپین کے قیام کے دوران اقبال کی ملاقات وہاں کے مشہور مستشرق پروفیسر آسین سے بھی ہوئی۔ پروفیسر آسین نے اپنی کتاب میں دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ اٹلی کے شاعر دانتے پران حدیثوں اور روایتوں کا اثر ہے جو معراج النبی اور عذاب و دوزخ کے سلسلہ

میں حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ اس پر وفیسر آسین ہی کی صدارت میں علامہ نے میڈرڈ یونیورسٹی میں ہسپانیہ اور عالم اسلام کا ارتقاء کے موضوع پر ایک عالمانہ لیکچر بھی دیا۔ اس جلسہ کی کارروائی دوسرے روز اسپین کے بڑے بڑے اخباروں میں چھپی۔

اسپین کے سفر کے بعد ۱۰ فروری ۱۹۳۳ء کو علامہ کا جہاز وینس کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ ۲۲ فروری کو آپ واپس بمبئی پہنچے۔

بعد کو علامہ نے اپنے سفر ہسپانیہ کے متعلق ایک خط میں لکھا:

میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ بھی لکھی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔"

ایک اور موقع پر علامہ نے اسلامی فن تعمیر کی قوت و ہئیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آگیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہراء دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے "مسجد قرطبہ" مہذب دیوؤں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا۔ پھر فرمایا میں الحمرا کے ایوانوں میں جابجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی ہر دیوار پر "ہو الغالب" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے کہیں انسان غالب نظر آتے تو بات بھی ہوتی"

وطن واپس پہنچ کر علامہ نے ۲۴ فروری ۱۹۳۳ء کو ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے فرمایا کہ میں گول میز کانفرنس میں صرف اس مقصد کے لیے شریک ہوا تھا کہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمان دوسری اقوام میں مدغم نہ ہونے پائیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مسئلہ کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی دوسری کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ شائع کر دیا۔ علامہ نے ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو ایک بیان جاری کر کے اس دستاویز پر متعدد اعتراضات کیے۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں علامہ مشہور تعلیمی ادارہ، جامعہ ملیہ دہلی میں پروفیسر مجیب کی دعوت پر تشریف لے گئے۔ آپ کی تقریر کا عنوان تھا۔ لندن سے قرطبہ تک، علامہ نے اپنی تقریر میں برگساں سے ملاقات کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ میں نے فلسفہ اسلامی کی بعض ایسی باتیں اسے بتائیں جن سے وہ اب تک بالکل بے خبر تھا۔ اور اس بے خبری کی وجہ سے تاریکی میں سرگرداں تھا۔

افغانستان کا سفر

بچہ سقہ کی ہنگامہ آرائیوں کو فرو کرنے کے بعد نادر شاہ جب دوبارہ افغانستان پر حکمران ہوا تو اس نے ملک میں وسیع تر اصلاحات کا آغاز کر دیا اور سب سے پہلے ملک کی تعلیمی حالت سدھارنے کی طرف توجہ دی اور ہندوستان کی تین مقتدر علمی شخصیتوں، سید سلیمان ندوی، اقبال اور سر راس مسعود کو افغانستان کا تعلیمی دورہ کرنے کی دعوت دی۔ تاکہ تعلیمی اصلاحات اور مجوزہ نئی یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا جا سکے علامہ کو ستمبر ۱۹۳۳ء میں اس دورے کی دعوت ملی۔ علامہ نادر شاہ کو پہلے سے جانتے تھے۔ جب وہ بچہ سقہ کے خلاف کارروائی کرنے بے سروسامانی کی حالت میں لاہور ہوتے ہوئے افغانستان جا رہے تھے تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر نادر شاہ کا استقبال کرنے والوں میں اقبال بھی تھے۔ گاڑی چلنے سے ذرا پہلے اقبال نے نادر شاہ کو ایک طرف لے جا کے کہا:

"تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ میں ایک فقیر آدمی ہوں صرف دعاؤں ہی سے تمہاری خدمت کر سکتا ہوں۔ اتفاق ہے اس وقت میرے پاس پانچ ہزار روپے موجود ہیں۔ اگر یہ حقیر سی رقم تمہارے کسی کام آسکے تو مجھے خوشی ہوگی۔ نادر خان نے جو چشم بر آب تھے فقیر کی اس دین کو نیک شگون سمجھتے ہوئے بڑے احترام سے قبول کر لیا۔ افغانستان روانہ ہونے سے پہلے ایک اور چھوٹا سا واقعہ ایسا ہوا جس سے اقبال کے فکر و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ سر راس مسعود کی بیگم نے بھی افغانستان جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان دونوں کی شادی نئی نئی ہوئی تھی۔ علامہ سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

افغانستان کی حکومت اپنے ثقافتی اور تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے ہندستان کے مقتدر مسلمانوں کا جو وفد بلا رہی ہے اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے پر وہاں کے حکمرانوں پر جو اثر ہوگا وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں اس سے شاید ہندوستان کے مسلمان ماہرین تعلیم کے نظریات پر ان کا وہ اعتماد باقی نہ رہے جس کی بنا پر انہوں نے اس وفد کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ علامہ نے یہ نازک بات اتنے واضح اور دو ٹوک انداز میں کی کہ لیڈی مسعود کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کی صبح کو وفد پشاور کے راستے کابل کو روانہ ہوا نادر شاہ سے اس وفد کی ملاقات قصرِ دل کشا میں ہوئی۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت اقبال شاہ کے لیے اپنے ساتھ قرآن مجید کا ایک نسخہ لے گئے تھے۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ پیش کرتے ہوئے آپ نے شاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اہلِ حق کی یہی دولت و ثروت ہے، اسی کے باطن میں حیاتِ مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا گداز سب اسی کا فیضان ہے

اقبال کے ہاتھوں قرآن مجید کا نسخہ وصول کرتے ہوئے نادر شاہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جواب میں اس نے یہ الفاظ کہے:

"جب میں جلا وطن تھا اور کوہ و صحرا میں غمزدہ وقت کاٹ رہا تھا، جب میرے پاس زندگی کے وسائل کی کمی تھی اور مادی طاقت کا فقدان تھا جب میرا کوئی ساتھی اور غم خوار نہ تھا تو یہی ام الکتاب میری رفیق و رہنما، ہمدرد و غم گسار تھی۔"

پہلی ملاقات میں مغرب کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی تو اقبال نے کہا:

"نادر شاہ، میں نے اپنی عمر کسی عادل بادشاہ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گذاری ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو، کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے آج میں تیری اقتداء میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ ہی کو کرنی پڑے گی۔"

قصرِ دلکشا میں علامہ کی نادر شاہ سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ افغانستان کے ملا شور بازار سمیت دوسرے زعماء اور فضلاء سے بھی گفتگو رہی۔ تعلیمی اصلاحات کا خاکہ بھی تیار ہوتا رہا۔ انجمن ادبی افغانستان نے شاندار سپاسنامہ پیش کیا۔ ان معروفیات کے علاوہ علامہ نے سلطان محمود کے مزار پر نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور غزنی کی سیر کی۔ حکیم سنائی کا مزار دیکھا۔ اور اس کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک روتے رہے۔ بابر کے مزار پر حاضری دینے کے علاوہ

قندھار بھی گئے جہاں حضور کے خرقہ مبارک کی زیارت کی۔ احمد شاہ ابدالی کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھی۔ کوئی چار ہفتے کے قیام کے بعد کوئٹے کے راستہ ۲ نومبر کو واپس لوٹے وطن واپس جانے سے پہلے علامہ نے افغانستان کے عوام کو براہ راست پیغام دیا۔

افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی سے آشنا کر سکے۔

اعزازی ڈگری

۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی نے علامہ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اقبال پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ ڈگری دی گئی۔ اس زمانے کے بارے میں ذکر اقبال میں ہے کہ ان تمام مصروفیتوں کے باوجود علامہ کے علمی تجسس اور تحقیق کی لگن میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس دور میں انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان سب میں زماں و مکاں کے متعلق مسلم علما۔ کے متعلق کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی ہے۔ مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ ان مسائل کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے فضلا جن نتائج پر آج پہنچے ہیں وہ مسلمانوں کے اکابر علم کو صدیوں پہلے معلوم تھے۔ غرض علامہ کا مقصد ہر حال میں یہی تھا کہ ہر شعبہ علم میں مسلمانوں کی برتری کا سکہ جمایا جائے۔

علالت کا آغاز

علامہ کی صحت ایک عرصے سے خراب چلی آ رہی تھی۔ درد گردہ کا پہلا دورہ ۱۹۱۷ء میں پڑا تھا مگر ۱۹۲۰ء میں دوسرا حملہ ہوا۔ حکیم نابینا صاحب کا علاج کرانے سے درد کو

کو تو افاقہ ہو گیا تھا لیکن مرض نہ گیا تھا۔ سن ۳۲، ۳۳ سے چھوٹے موٹے عوارض کا سلسلہ چل رہا تھا اور جو آنکھ سلامت تھی اس کی بینائی بھی موتیا اترنے سے متاثر ہونے لگی تھی۔ لیکن ان عوارض کے باوجود ان کی سیاسی و علمی سرگرمیاں جاری تھیں اور باہر سے دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی صحت کو گھن لگ چکا ہے۔ ۱۹۳۴ء کے اوائل میں ان کی اس خطرناک علالت کا آغاز ہوا جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوئی۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو عید الفطر کا دن تھا علامہ اپنے بیٹے جاوید اقبال اور دیرینہ خادم علی بخش کے ساتھ بادشاہی مسجد نماز کے لیے گئے۔ ایک تو اس دن یوں بھی سردی زیادہ تھی دوسرے علامہ صرف شلوار کوٹ پہنے ہوئے تھے نہ کوئی کمبل تھا نہ گلو بند۔ موٹر میں آتے جاتے ہوا لگی۔ شاہی مسجد کے صدر دروازے سے محراب مسجد تک ننگے پاؤں اس فرش پہ دوبارہ چلنا پڑا جو سردی کی شدت سے یخ ہو رہا تھا۔ غرض ٹھنڈ لگ گئی۔ واپسی پہ گھر جا کر اپنے والد مرحوم کی تقلید میں دہی ڈال کر سویاں کھائیں۔ کھاتے ہی شدید نزلہ ہو گیا۔ مزاج پہلے سے بلغمی تھا۔ گلا اکثر خراب رہتا تھا۔ دہی سویوں نے گلے کو جکڑ لیا۔ معمول کے مطابق علاج ہوا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ علی بخش کا بیان ہے کہ اس تکلیف کو شروع ہوئے پندرہ دن گزرے تھے کہ رات کو میری آنکھ دفعتاً کھل گئی۔ اس وقت کوئی دو ڈھائی بجے کا عمل ہو گا کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب چارپائی پر بیٹھے بے حال ہو رہے ہیں۔ صبح تک یہی حالت رہی۔ اب ان کے لیے مسہل تجویز کیا گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ کھانسی تو جاتی رہی مگر گلا بیٹھ گیا اور مسلسل یونانی اور ڈاکٹری علاج کے باوجود ٹھیک نہ ہوا۔ سید نذیر نیازی جو علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے لکھتے ہیں۔

جب میں ۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو دلی سے لاہور آیا اور علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو [illegible]

نے زرد چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ آواز نہایت کمزور تھی جیسے کوئی سرگوشیاں کرتا ہو۔ اٹھنے بیٹھنے سے بھی ضعف و نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔"

نذیر نیازی کے استفسار پر علامہ نے بتایا کہ ایکس رے کیا گیا ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے اور ڈاکٹروں نے رائے دی ہے کہ زندگی خطرے میں ہے۔ اس پر نیازی صاحب نے کہا کہ اس سے قبل جب درد گردہ کی وجہ سے آپریشن کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا تھا تو حکیم نابینا صاحب نے آپ کا نہایت معجزنما علاج کیا تھا۔ موجودہ علالت میں بھی کیوں نہ ان سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ علامہ نے حکیم نابینا صاحب سے رجوع کیا۔ علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹروں نے بیماری کے متعلق کئی رائیں قائم کی تھیں لیکن حکیم نابینا صاحب اسی رائے پر جمے رہے کہ اعصاب میں برودت ہے قلب ضعیف ہے، جگر میں حدت پیدا ہو گئی ہے۔ ہلکا سا دمہ ہے۔ بلغم کے انجماد کو ڈاکٹروں نے غلطی سے رسولی سمجھ لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں لندن جانے کا بھی مشورہ دیا تھا۔ لیکن انہیں حکیم صاحب کی تشخیص پر کلی اعتماد تھا۔ جون ۱۹۳۴ء کے آغاز میں علامہ ایک دن کے لیے خود بھی دلی گئے۔ حکیم صاحب نے ان کی حالت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ دوائیں جاری رہیں علامہ کی صحت روز بروز بہتر ہو رہی تھی۔ علامہ اپنی صحت سے اس حد تک مطمئن تھے کہ وہ رہوڈز لیکچرز کے لیے آکسفورڈ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی طرف سے بھی دعوت موصول ہوئی تھی۔ لیکن حسب عادت وہ مناسب پرہیز نہ کر سکے۔ دہی کھایا۔ لسی پی۔ برف ڈال کر فالودہ پیا۔ حکیم صاحب نے مغز خرگوش کھانے کو کہا تھا۔ علامہ نے کہا! معاذاللہ۔ مغز تو ایک طرف مجھے تو دل، کلیجی، گردے وغیرہ کھانے سے بھی کراہت محسوس ہوتی ہے۔ غرض مغز کسی صورت میں استعمال نہیں کیا۔ نتیجۃً طبیعت پر برا اثر

پڑا۔ چنانچہ ۲۴ جون ۱۹۳۴ء کو حکیم صاحب کو خط میں لکھا:

"آواز میں کوئی فرق نہیں بلکہ تنزل محسوس ہے۔"

سرہند کا سفر

صرف آواز متاثر تھی۔ مجموعی صحت اتنی بُری نہیں تھی طبیعت میں امنگ عود کر آئی تھی۔ اس لیے شدید گرمی میں سرہند میں حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر جانے کا ارادہ کیا۔ سرہند جانے کے متعلق نذیر نیازی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

آج شام کی گاڑی سے سرہند جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے یہ پیغام دیا:

ہم نے جو خواب تمہارے اور شلیب ارسلان (جو اتحادِ اسلامی کے زبردست داعی تھے) کے متعلق دیکھا ہے وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے"۔ اسی خواب کی بنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جاوید جب پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب وہ ذرا بڑا ہوگا تو حضرت (مجدد) کے مزار پر لے جاؤں گا۔ وہ بھی ساتھ جائے گا۔ تاکہ یہ عہد پورا ہو جائے"۔

چنانچہ علامہ شدید گرمی میں جاوید کو لے کر ۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو سرہند گئے۔ ۳۰ کو واپس آگئے۔ سرہند میں حضرت مجدد کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد آپ نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگایا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ مزار کی فضا میں ان کی آواز سے عجیب ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ آنسو اُن کے رخساروں سے بہہ بہہ کر قرآن مجید کو تر کر رہے تھے۔ ۳ جولائی کو سرہند کے بارے میں لکھا:

"مزار نے میرے دل میں بہت اثر پیدا کیا۔ بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ پانی اس کا سرد و شیریں ہے۔ سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا جس کی بنا حضرت عمرو بن العاص نے رکھی تھی۔ اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاہور سے وسعت اور آبادی میں دگنا۔"

سرہند کے سفر کے بعد ان کی عام صحت اور بحال ہو گئی۔ صرف آواز کی کمزوری باقی تھی۔ یکم جولائی کو وہ ایک بار پھر انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے علمی اور ادبی مشاغل کو از سر نو شروع کیا۔ سیاحتِ افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو "مسافر" کے عنوان سے مرتب کیا۔ بال جبریل کے بعض اجزا ابھی نامکمل پڑے تھے۔ ان کی ترتیب و تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ خطبات مدراس کے اردو ترجمے پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے۔ خالص اسلامی ادبیات کی تحقیق کے لیے ایک ادارہ نشر و اشاعت کے قیام پر بھی غور کر رہے تھے۔

جاوید منزل کی تعمیر

۱۹۳۴ء کے اواخر میں علامہ نے میو روڈ پر سات کنال کا ایک قطعہ اراضی کوٹھی کے لیے خریدا اور اس کی تعمیر کا کام کلی طور پر اپنے بڑے بھائی کے سپرد کر دیا اور خود وہاں اسی دن گئے جب کوٹھی بن کر مکمل ہو گئی۔ ۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مشہور قانون دان سر تیج بہادر سپرو ملاقات کے لیے آئے۔

علی گڑھ اور دہلی کا سفر

۱۸ دسمبر کو علامہ علی گڑھ گئے واپسی پر دہلی میں اپنے

معالج حلیم نابینا صاحب سے ملے جنہوں نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ گلے کی حالت اب بھی وہی تھی۔

بالِ جبریل کی اشاعت

اوائل جنوری ۱۹۳۵ء میں علامہ کا دوسرا اُردو مجموعہ کلام بالِ جبریل کے نام سے شائع ہُوا اور حسبِ معمول اس کی بھی پرجوش پذیرائی ہوئی۔

علاج کے لیے بھوپال کا سفر

علامہ کی عام صحت تو بہتر تھی لیکن گلا ٹھیک نہ ہو رہا تھا۔ ایک مخلص دوست ڈاکٹر نے تجویز کیا تھا کہ برقی بنفشی شعاعوں کا علاج بہتر ہوگا۔ چنانچہ سرسید کے پوتے، سر راس مسعود نے جو بھوپال میں وزیرِ تعلیم تھے اور علامہ سے مخلصانہ مراسم رکھتے تھے۔ دعوت دی کہ علامہ بھوپال تشریف لا کر برقی علاج کرائیں جس کا بہترین انتظام وہاں تھا۔ چنانچہ علامہ بجلی سے علاج کے لیے ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے ۳۰ کو دہلی پہنچے۔ وہاں جامعہ ملیہ میں خالدہ ادیب خانم کے لیکچر کی صدارت کر کے اسی دن شام کو بھوپال روانہ ہو گئے۔ ۳۱ جنوری کو بھوپال پہنچے۔ بھوپال کے نواب حمید اللہ خان نے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرنے پر اصرار کیا تو کہا وہ اپنے دوست سر راس کی دعوت پر وہاں آئے ہیں اس لیے ان ہی کے یہاں قیام کرنا ان کے لیے مناسب ہوگا۔ چنانچہ سر راس مسعود کے دولت کدہ ریاض منزل میں ٹھہرے۔ پھر بھی حمید اللہ نے اپنے ملٹری سیکرٹری کرنل محمد خان کو ان کی مہمان داری کے لیے مقرر کر دیا۔ جو ہر وقت حاضر خدمت

رہے۔ تاکہ انہیں بھوپال میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ انہوں نے علامہ سے پوچھا میں کونسی خدمت بجالاسکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا:

میرا کھانا سادہ ہونا چاہیے۔ میں ڈائیننگ روم میں کھانے کا عادی نہیں ہوں اس لیے میں اگر ڈائیننگ ہال میں نہ آسکوں تو بُرا نہ منائیے مجھے جس وقت بھی بھوک لگے گی کھالوں گا۔"

کرنل محمد خان کا بیان ہے کہ جب کھانے کے بعد وہ علامہ کا کمرہ دیکھنے گئے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اعلیٰ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے محترم مہمان کے لیے بچھوایا تھا ان کے خدمت گار علی بخش نے اُٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ علامہ کا سادہ سا بستر لگا دیا تھا جب انہوں نے دریافت کیا تو علی بخش نے بتایا کہ علامہ ہمیشہ اپنے ہی بستر پر سوتے ہیں۔" کرنل محمد خان نے یہ بھی نوٹ کیا کہ علامہ کے بستر پر دو کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوانِ غالب، علی بخش نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر یہی دو کتابیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

علامہ کے علاج کے لیے بھوپال کے حمیدیہ اسپتال کے بہترین ڈاکٹروں اور شہر کے ممتاز اطباء نے تفصیل سے دو تین روز آپ کا معائنہ کیا اور کوئی سوا مہینے میں چار مرتبہ بجلی کا علاج ہوا۔ آواز میں کچھ فرق بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ آٹھ دس مرتبہ کے علاج کے بعد ہی خاطر خواہ نتیجہ نکل سکے گا۔ علامہ اور ٹھہرتے مگر بیگم کی علالت کی وجہ سے بھوپال سے آنا پڑا۔ ۷ مارچ کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ دو روز دہلی میں ٹھہرے حکیم نابینا صاحب سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹروں نے بھی انہی کی تشخیص کی تائید کی تھی۔ ان ہی کا علاج جاری رکھا اور ۹ مارچ کو لاہور پہنچے۔ علامہ ... عدم

موجودگی میں مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور علامہ کی مزاج پرسی کے لیے ان کے گھر آئے تھے
ان کے موجود نہ ہونے سے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس امر کی اطلاع ۱۱ مئی کو اپنے ایک
دوست ڈاکٹر لمعہ کو خط کے ذریعہ دی۔

سردار بیگم کا انتقال

علامہ کی دوسری بیوی سردار بیگم (والدہ جاوید) یوں تو ایک عرصہ سے بیمار
تھیں۔ ۲۵ اپریل کو انہیں ٹائیفائڈ ہوا اور بگڑ گیا۔ آخر کار ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کا انتقال
ہو گیا۔ ۲۴ مئی کو آپ نے ایک خط میں لکھا:

"کل شام والدہ جاوید اس جہاں سے رخصت ہو گئیں۔ ان کے آلام و مصائب
کا اور میرے اطمینان قلب کا خاتمہ ہوا۔ اللہ فضل کرے ہر چہ از دوست می رسد نکوست"

انہوں نے غلط نہیں لکھا کہ "میرے اطمینان قلب کا خاتمہ ہوا" ان کے انتقال
سے واقعی علامہ کے اطمینان قلب کا خاتمہ ہو گیا۔ بیس اکیس برس کا ساتھ تھا۔ مرحومہ
کو علامہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ وہ ان کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ان کو انہوں نے
وہ ضروری آسائش، آرام اور گھر کا سکون دیا جس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔ ان کی وفات
اس اعتبار سے اور بھی زیادہ دردناک تھی کہ میورروڈ پر اپنی کوٹھی میں منتقل ہوئے انہیں
تین ہی دن ہوئے تھے۔ گھر کا سارا سامان بکھرا پڑا تھا۔ مرحومہ کو وفات سے کچھ پہلے اپنے
آخری وقت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے خود بتاتی رہیں کہ کونسی چیز کہاں رکھی ہے علامہ
نے قطعۂ تاریخ کہا جو لوح قبر پر درج ہے۔

وکالت اور بھوپال کا وظیفہ:- ۱۹۰۸ء کے بعد سے کبھی آپ نے کسی قسم کی

ملازمت نہیں کی معاش کا واحد ذریعہ وکالت تھی۔ جس سے آپ کی دلچسپی واجبی ہی سی تھی۔ اس کو آپ نے آمدنی اور دولت اندوزی کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ وہ اتنے ہی مقدمے لیتے تھے جن کی آمدنی سے گھر کا خرچ پورا چل جائے۔ چنانچہ وہ ہر مہینے کی دس تاریخ کے بعد کوئی مقدمہ نہ لیتے اور اگر کوئی مؤکل اصرار کرتا تو اُسے اپنے کسی دوست کا پتہ بتا دیتے۔ اس پر بھی وہ نہ ٹلتا تو اسے اگلے مہینے کی شروع تاریخوں میں آنے کا مشورہ دیتے اس محدود وکالت کا بھی ایک اصول تھا۔ اگر کوئی مقدمہ جھوٹا یا کمزور ہوتا تو اسے نہ لیتے اور مؤکل کو سمجھاتے کہ تمہارے کیس میں جان نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اپنا روپیہ ضائع مت کرو ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس ایک کیس لایا۔ جس کے بارے میں علامہ کا خیال تھا کہ بالکل بے جان ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقدمے کی پیروی کرنے سے معذرت کر دی۔ لیکن مؤکل اپنی ضد پر اڑا رہا اور کہنے لگا اس مقدمے کی پیروی کی آپ مجھ سے منہ مانگی فیس وصول کریں اگر میں مقدمہ ہار بھی گیا تو مجھے کوئی افسوس نہ ہو گا پیسہ کمانے کا یہ اچھا موقعہ تھا۔ لیکن آپ نے صاف کہہ دیا میں حرام کی کمائی کا قائل نہیں ہوں۔ اس پر خفا ہو کر چلا گیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ صاحبزادہ محمود الحسن نے بیان کیا ہے"

وہ لکھتے ہیں۔ پٹنہ میں علامہ اقبال کے ایک دوست، بیرسٹر سی آر داس کے پاس ریاست آرہ کی جائیداد کا مقدمہ آیا۔ اس مقدمہ میں نواب آرہ کو جن دستاویزات کو پیش کرنا تھا وہ فارسی میں تھیں۔ ترجمہ انگریزی میں ہونا تھا۔ سی آر داس بیرسٹر نے اس کام کے لیے ڈاکٹر اقبال کو چنا اور انہیں ایک ہزار روپے روز کے مشاہرے پر بلایا۔ علامہ آئے رات کو وہ فارسی دستاویزات دیکھیں اور رات ہی کو انگریزی

ترجمہ مکمل کر دیا اور صبح سویرے سارے کاغذات سی آر داس کے حوالے کر دیئے۔ سی آر داس بہت حیران ہوتے پھر کہا۔ آپ نے یہ کیا کیا۔ یہ کام تو آپ کو کئی دن میں کرنا تھا۔ آپ کا مشاہرہ ہزار روپیہ فی روز ہے۔ کم از کم دو چار ہزار تو بنتے۔ یہ سن کر ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا۔ میرے کرم فرما داس! میرے رسول نے مجھ پر ایسی اُجرت حرام کر دی ہے جو کسی مختصر کام کو طول دے کر لی جائے۔"

وکالت میں اس اصُول پرستی اور بے لچک دیانت سے روپیہ کہاں سے جمع ہوتا۔ چنانچہ وکالت سے علامہ کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپیہ ماہانہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اس میں سے دو تین سو ملازمین کے نکل جاتے باقی سے خود گزارہ کرتے۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں آواز بیٹھ جانے اور صحت خراب رہنے سے آمدنی کا یہ محدود ذریعہ بھی جاتا رہا۔ علاج معالجہ میں روپیہ صرف ہوتا رہا۔ کتابوں کی آمدنی جو کچھ تھی وہ جاوید منزل کی تعمیر میں صرف ہو گئی تھی۔ ان حالات میں والدہ جاوید کے بیمار ہونے سے جو مالی دباؤ پڑا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ علامہ مالی مشکلات میں گھر گئے لیکن خود داری کی وجہ سے کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اس زمانے میں اپنے نیاز مند نذیر نیازی کو جو دہلی میں تھے لکھتے ہیں:

(والدہ جاوید کے علاج کے سلسلہ میں) یہاں کے اطباء پر مجھے اعتبار نہیں انگریزی علاج سے امراض میں فائدہ نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے یہ طریق پہلے بھی آزمایا جا چکا ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک روز کے لیے حکیم نابینا صاحب قبلہ لاہور تشریف لے آئیں مجھے معلوم نہیں۔ ان کی فیس کیا ہے اس کے علاوہ وہ خود بھی ضعیف ہیں یا نہیں سب حال معلوم کر کے اطلاع دیں۔ اگر وہ کچھ کم فیس قبول کریں

ہیں ان کی اس عنایت کا بڑا شکر گزار ہوں گا۔ ایک سال سے زیادہ مدت ہوئی ہے کہ میں اپنی علالت کی وجہ سے کچھ کام نہ کر سکا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے ہیں۔ تاہم جہاں تک ممکن ہو سکے گا۔ میں حکیم صاحب کے سفر کا بار اُٹھانے کو حاضر ہوں رات کو وہاں سے سفر کریں اور صبح یہاں پہنچیں پھر اسی شام کو رخصت ہو سکتے ہیں زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ میں پریشان خاطر ہوں۔"

سر راس مسعود کو علامہ کی پریشان خاطری کا علم تھا اور وہ ان سے نیازمندانہ ارادت رکھتے تھے چنانچہ ان کے ایماء سے نواب بھوپال حمید اللہ خان کی طرف سے پانچ سو روپیہ کا وظیفہ مئی ۱۹۳۵ء میں مقرر کیا گیا۔ جب علامہ کو نواب صاحب کی اس فیاضی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی خودداری اور درویشانہ طبیعت کے پیش نظر اسے قبول کرنے میں تامل سے کام لیا۔ لیکن جب ان کے عزیز دوست سر راس مسعود اور خود نواب صاحب نے بھی یہ یقین دلایا کہ یہ ریاست کی طرف سے نہیں بلکہ ایک مخلص دوست کے اظہار عقیدت کے طور پر ہے۔ تو آپ نے اسے قبول کر لیا۔ شکریے کے طور پر سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔"

اس کے بعد سر راس مسعود نے کوشش کی کہ سر آغا خان بھی اتنی ہی رقم دینے پر آمادہ ہو جائیں تا کہ علامہ اپنی باقی زندگی کے ایام آرام سے گزار سکیں۔ ان کی کوششوں سے یہ وظیفہ بھی منظور ہو گیا مگر جب علامہ اقبال کو پتہ چلا تو انہوں نے سر راس مسعود کو لکھا:

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ ہو تو بھی میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے آپ کو میرے خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے"۔

اواخر مئی ۳۵ میں والدہ جاوید کی رحلت سے علامہ ٹوٹ سے گئے تھے۔

۷۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر لمعہ کو لکھا:

میری صحت ٹھیک ہے مگر روز بروز انحطاط محسوس کر رہا ہوں، انحطاط کے اسی احساس کے پیش نظر علامہ برقی علاج کے لیے دوسری دفعہ ۱۵۔ جولائی کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ اس بار علی بخش کے علاوہ چھوٹا بیٹا جاوید اقبال بھی ساتھ تھا۔ ۱۷۔ جولائی کو بھوپال پہنچے۔ اس بار نواب بھوپال کی خواہش پر آپ سرکاری قیام گاہ شیش محل میں ٹھہرے۔ اس دفعہ ان کا خیال تھا علاج کے ساتھ ساتھ قرآن کے حواشی لکھنے میں بھی وقت صرف کر سکیں گے۔ وہ مجوزہ حواشی تو نہیں لکھ سکے۔ البتہ چند نظمیں ضرور ہوئیں (جو اب ضرب کلیم میں شامل ہیں) انہی دنوں میں آپ نے قادیانی فتنے پر بھی مضامین لکھے اور مسلمانوں کو عصر حاضر کے اس نئے فریب سے خبردار کیا۔ بجلی کے علاج کے اس دوسرے کورس سے کافی افاقہ ہوا۔ سوا مہینے قیام کرنے کے بعد ۲۸۔ اگست ۱۹۳۵ء کو علامہ بھوپال سے واپس روانہ ہوئے۔ بھوپال کے اس قیام میں جاوید کو پڑھانے کے لیے ایک استاد بھی مقرر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی

کتاب "مئے لالہ فام" میں اقبال باپ کی حیثیت سے" جو مضمون لکھا ہے اس میں اس سفر کے تاثرات رقم کیے ہیں لکھتے ہیں :-

تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز میں ابا جان کے ساتھ سید راس مسعود کے ہاں ریاض منزل جایا کرتا تھا وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنہیں میں نے ابا جان کو اقبال کہہ کر پکارتے سُنا۔

(پہلے یہ حق محمد علی جوہر کو حاصل تھا) سید راس مسعود قد میں ابا جان سے بہت اُونچے، قوی ہیکل، گورے چٹے بزرگ تھے مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ میں اور ابا جان ہفتہ میں دو ایک بار رات کا کھانا سید راس مسعود اور بیگم امتہ المسعود کے ساتھ ریاض منزل میں کھایا کرتے۔ بسا اوقات ہم اور جگہوں پر بھی کھانے پر مدعو ہوتے ایک مرتبہ ہم کھانے سے واپس لوٹ رہے تھے اور گاڑی میں ابا جان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی فربہ سی ہنس مکھ خاتون بیٹھی تھیں وہ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ بعد میں ابا جان نے مجھے بتایا کہ وہ انگریزی کی مشہور شاعرہ ادیبہ اور سیاسی رہنما سروجنی نائیڈو تھیں۔ اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کر رکھی تھی کہ جاوید کو ساتھ لائیے۔ سید راس مسعود بھی ہمارے ہمراہ تھے جب ان دونوں بزرگوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جھک کر فرشی سلام کیے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بہر حال بھوپال میں میرا بیشتر وقت ابا جان کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چھچہ اس طرح پکڑنا چاہیے اور کانٹا یُوں۔ میں فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا اس لیے جب کبھی انہیں لوگ وہاں ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ساتھ جاتے تو مجھے ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں

کے سامنے خاموش بیٹھنے کے بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیے۔ بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لیے دلی ٹھہرے۔ وہاں ابا جان خود مجھے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لیے لے گئے۔ پہلے لال قلعہ دیکھا۔ پھر نظام الدین اولیاء گئے۔ پھر نئی دلی سے ہوتے ہوتے قطب مینار پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اُوپر چڑھ جاؤں اور میں نے ابا جان کو بھی ساتھ آنے کو کہا مگر وہ بولے تم جاؤ میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا اور جب اُوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا کہیں دہشت سے گر نہ پڑو"

علامہ دلی سے ہوتے ہوتے ۳۰ اگست ۱۹۳۵ء کو واپس لاہور پہنچے۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں صد سالہ جشن حالی کی تقریب تھی۔ حالی سے علامہ کو خود عقیدت تھی اور اس تقریب میں نواب حمید اللہ خان بھوپال بھی تشریف لا رہے تھے اس لیے علامہ نے پانی پت جانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو وہ جاوید اقبال کے ہمراہ پانی پت پہنچے۔ چونکہ گلا خراب تھا اور طبیعت بھی ناساز تھی اس وجہ سے نواب صاحب کے سامنے فارسی کے صرف چار شعر پڑھے۔

صد سالہ جشن حالی کے سلسلہ میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں آپ کی نظم حالی مسلم ہائی اسکول کے ایک اُستاد نے ترنم سے پڑھ کر سنائی۔ پانی پت میں علامہ کا قیام دو روز تک رہا۔ اس دوران میں آپ نے حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کے مزار پر حاضری دی اور نذر عقیدت پیش کی۔ شاہ بو علی قلندرؒ سے اقبالؒ کے والد شیخ نور محمد کو بھی ارادت تھی اور انہوں نے اقبال سے شاہ صاحب کی مثنوی کے طرز پر فارسی میں مثنوی لکھنے کو کہا تھا۔ جس کا تذکرہ عطیہ فیضی کے نام ایک خط میں ہے۔ اپنے بیٹے جاوید کو لے جانے میں مصلحت غالباً یہ تھی کہ وہ اس گھر کے عارفانہ مزاج کو جذب کرلے

جس گھر کا چراغ ہے تو
مزاج ہے اس کا عارفانہ

علامہ کی عام صحت روبہ زوال تھی۔ بینائی بھی کمزور ہو رہی تھی صرف گلے کی تکلیف میں بجلی کے علاج سے قدرے افاقہ تھا۔ اس لیے برقی علاج کے تیسرے کورس کے لیے علامہ ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ ایک دن دہلی ٹھہرے۔ ۲ مارچ کو بھوپال پہنچے۔ اس بار بھی آپ کو شاہی مہمان کی حیثیت سے شیش محل میں ٹھہرایا گیا۔ حسب معمول علی بخش آپ کے ساتھ تھا اور آنے جانے کی سہولت کے لیے ایک کار حاضر خدمت رہتی تھی۔

اس قیام کے دوران میں نواب بھوپال اکثر آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے تھے اور آپ کے قیمتی خیالات اور مشوروں سے مستفید ہوتے تھے۔ ریاست کا نظم و نسق بھی زیر بحث آتا تھا۔ ملاقات کے دوران علامہ نے نواب بھوپال کو مشورہ دیا کہ ریاست کے غیر آباد حصوں کو آباد کرنے کے لیے ریاست کی جانب سے کاشت کاروں کو سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ غیر آباد زمینوں سے حاصل ہونے والی پیداوار سے عوام کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکے اور یوں کسی حد تک بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل پر قابو پایا جا سکے۔ نواب صاحب نے علامہ اقبال کی اس تجویز کو بہت پسند کیا اور ضروری اقدامات کے لیے احکام جاری کر دیئے۔

علامہ اقبال جمعہ کی نماز جامع مسجد یا موتی مسجد میں ادا کرنے کے لیے جاتے تھے۔ جہاں بے شمار لوگ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے اور ارشادات سننے کے لیے بیٹھے رہتے۔ اس قیام کے دوران علامہ اقبال بسا اوقات رات گئے تک کوٹھی

کے شہہ نشین پر تنہا بیٹھے رہتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی فکر اور غم میں مبتلا ہیں۔

علامہ کے قیام بھوپال کے زمانہ کا ایک فکر انگیز واقعہ رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" میں لکھا ہے جس سے اقبال کے فکر و نظر کی سمتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

اقبال مرحوم کو سر راس مسعود سے بڑی شفتگی تھی اسی طرح راس مسعود کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کروایا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹے تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سُناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لیڈی موصوفہ کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔

علامہ اقبال کا ملازم علی بخش اس خدمت پر مامور تھا کہ جب قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سُننے کے لیے بلائے۔ علامہ خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ مرحوم نے علی بخش کو آواز دی۔ کہ قاری صاحب آتے ہوتے ہیں۔ لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر تلخ اور آزردہ ہو کر اپنی زبان میں کہا:

"قرآن کیا سُنیں گی۔ وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں۔ میں کیا کروں، علامہ خاموش ہو گئے پھر فرمایا: صبر! علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔"

اس واقعہ پر رشید احمد صدیقی تبصرہ کرتے ہوتے لکھتے ہیں :۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا سا ہی جملہ ان کی فکر و فرزانگی، شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے، اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سب سے بڑے ہیں، منفرد ملتے ہیں اور جدا ہو کر ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے"

ضرب کلیم کی اشاعت

۹/اپریل ۱۹۳۶ء کو علامہ بھوپال سے لاہور پہنچے ۔ ۱۲/اپریل کو انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں آخری بار تشریف لائے۔ برسہا برس سے عوام و خواص انجمن کے جلسوں میں ان کے سرمدی نغمے ان کی سرمدی آوازیں سنتے رہے تھے۔ اب ان کی آواز بیٹھ چکی تھی کمزور اتنے تھے کہ اسٹیج پر کرسی ڈال کر ان کو بٹھایا گیا تاکہ سب اس بطل جلیل کی زیارت کریں۔ ان کے ایما پر محمد صدیق اور محمد امین نے ان کے وہ چند اشعار ترنم سے سنائے جن کا مطلع ہے :

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ غزل ضرب کلیم میں شامل ہے جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں بھوپال سے آکر شائع کی، اور چند ماہ بعد ستمبر میں فارسی کی نظم پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق کو بھی مکمل کر کے چھاپ دیا۔

قائدِ اعظم سے ملاقات اور پنجاب مسلم لیگ کی صدارت

علامہ گذشتہ تین چار سال سے سیاست سے کنارہ کش سے تھے۔ مسلم کانفرنس کی صدارت سے بھی مستعفی ہو گئے تھے کچھ علالت کے سبب سے اور کچھ حالات کی وجہ سے۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کا اعلان ہوتے ہی سیاسی صورت حال یکسر بدل گئی۔ صوبائی انتخابات سر پر آ گئے تھے۔ قائدِ اعظم ۱۹۳۴ء کے اواخر میں انگلستان سے واپس آ چکے تھے اور مسلم لیگ کو زندہ کر رہے تھے۔ اب اگر ملک بھر میں مسلمانوں کو منظم نہ کیا جاتا تو ان کوششوں کے رائیگاں جانے کا خطرہ تھا جو ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی تاسیس سے مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کو برقرار اور مستحکم کرنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔ اس لیے مرکزی مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ صوبائی انتخاب کرانے کے لیے مرکز اور صوبوں میں پارلیمانی بورڈ قائم کیے جائیں اس مقصد کے لیے قائدِ اعظم نے ملک کا دورہ شروع کیا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو وہ لاہور آئے اور میاں فضل حسین کو صوبائی پارلیمانی بورڈ بنانے کی دعوت دی۔ جو انہوں نے بے رخی سے مسترد کر دی۔ ان سے مایوس ہو کر قائدِ اعظم نے اقبال سے رجوع کیا۔ وہ مئی ۱۹۳۶ء کے اوائل میں جاوید منزل میں جا کر علامہ سے ملے۔ علامہ نے قائدِ اعظم کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور برضا و رغبت بلکہ باکمال شوق پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو اور پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اقبال پنجاب مسلم لیگ اور پارلیمانی بورڈ کے صدر منتخب ہوتے ۸ مئی ۱۹۳۶ء ہی کو انہوں نے بورڈ کی طرف سے قائدِ اعظم اور مرکزی مسلم لیگ بورڈ کی حمایت میں بیان شائع کر دیا اور انتخاب میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ اس زمانے میں علامہ کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ عملی سیاست میں اتنا حصہ لیتے۔ لیکن انہیں اس

تاریخی لمحے کی سیاسی اہمیت کا احساس تھا اس لیے انہوں نے بستر علالت سے اپنی تمام ذہنی و فکری قوتیں مسلمانوں کی خدمت میں صرف کر دیں۔ ان کا گھر وہ مرکز تھا جہاں سے وہ ایک جرنیل کی طرح سیاسی جنگ کی کمان کر رہے تھے۔ اس کا ثبوت ان کے وہ سیاسی خطوط ہیں جو انہوں نے قائداعظم کی رہنمائی کے لیے ۲۲ مئی سے نومبر ۱۹۳۷ء تک قائداعظم کو لکھے اور جن کی سیاسی اہمیت کا اعتراف خود قائداعظم نے اس پیش لفظ میں کیا ہے جو انہوں نے ان خطوط کو شائع کرتے وقت لکھا:

۲ مئی ۱۹۳۶ء کو جب قائداعظم علامہ سے ملاقات کے لیے بہ نفس نفیس جاوید منزل آئے تو حسب معمول علامہ بنیان اور دھوتی میں ملبوس حقہ پی رہے تھے۔ جب انہیں کسی نے بتایا کہ قائداعظم کے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں تو وہ لپک کر اُٹھے اندر کمرہ سے قمیض اُٹھا کر لائے اور جلدی سے گلے میں ڈال لی۔ یہ ایک خاتون (فاطمہ جناح) کا احترام تھا ورنہ اس دربار میں بادشاہ و گدا کی تمیز نہ تھی۔

قائداعظم اور فاطمہ جناح کی علامہ سے اس ملاقات کی ایک جھلک جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں پیش کی ہے یہ لکھتے ہیں:۔

جب میں آٹو گراف لینے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا ابا جان کے پاس ایک دُبلے پتلے مگر نہایت خوش پوش شخص بیٹھے تھے ان کی آنکھوں میں عقاب جیسی پھرتی تھی اور ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ ابا جان نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں نے آٹوگراف کی کتاب آگے بڑھا دی۔ مہمان نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا "کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟" میں نے کہا "جی نہیں" جس پر انہوں نے سوال کیا۔ "پھر تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟" میں خاموش رہا۔ وہ ہنستے ہوئے ابا سے

مخاطب ہوتے۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ جواب نہیں دے گا ابا جان بولے کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ اِسے بتائیں گے کہ اسے کیا کرنا ہے۔" میری آٹو گراف کی کتاب پر دستخط کر دیئے گئے یہ میری خالق پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح سے پہلی ملاقات تھی۔"

علامہ نے قائداعظم کو جتنے خطوط لکھے اُن کا لب لباب یہی تھا کہ مسلم کلچر کی برتری ثابت کیجئے۔ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنائیے۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کو حل کیجئے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم صوبوں اور مسلم ریاستوں کے وفاق کا قیام ضروری ہے۔ اس طرح کے خطوط علامہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد قائداعظم کو لکھتے رہتے۔ صحت گرتی جا رہی تھی۔ بینائی کی کمی کی وجہ سے پڑھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ لیکن حوصلے بلند تھے۔

۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو راس مسعود کو لکھا: امسال دربارِ حضورؐ میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش آ گئے انشاء اللہ امید ہے کہ سال آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا۔" اپنی کہن سالی اور علالت کے باوجود وہ ملی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اسی سال جنوری کے اواخر میں مصری علماء کا ایک وفد لاہور آیا تھا۔ علامہ نے اس کے اعزاز میں سپینسر ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی۔ جوں جوں صحت گرتی جاتی تھی ان کے دل میں حج پر جانے کی آرزو شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ ۲۳ جنوری ۱۹۳۷ء کو حیدر آباد دکن کے سر اکبر حیدری کو لکھا:

تنہا خواہش جو ان دنوں میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کے مزار پر حاضری دوں جس کا

ذاتِ الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمۂ الہام رہا ہے، چونکہ صحت کی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور اپنے فرائض منصبی انجام دینے سے قاصر تھے لہٰذا یکم جولائی ۱۹۳۷ء کو علامہ نے انجمن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن جہاں تک ملی سیاست میں دلچسپی کا تعلق ہے اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان کے ذہنی قویٰ پوری طرح کام کر رہے تھے بصارت سے محروم ہو رہے تھے۔ لیکن بصیرت کی روشنی قائم تھی۔ اپنی تمام سیاسی زندگی کے بہترین خطوط انہوں نے ۱۹۳۷ء ہی میں لکھے جب مسلمان قائداعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اپنی بقار کی آئینی جنگ لڑ رہے تھے۔

۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے مشہور خط میں انہوں نے قائداعظم کو لکھا:

آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کی ذات سے مسلمان قوم اس طوفان بلا میں صحیح و محفوظ رہنمائی کی توقع کر سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔" اسی خط میں ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی، توہین مذہب کے واقعات اور مسلمانوں کی لاعلاج معاشی تنگدستی کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی بات پر زور دیا ہے کہ:

"ایک پرامن ہندوستان، حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ لسانی، مذہبی اور نسلی میلانات کی بنا پر ملک کو از سر نو تقسیم کر دیا جائے۔"

علامہ کی بڑی خواہش تھی کہ مسلم لیگ کو مسلم عوام کی جماعت بنایا جائے۔ چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو علامہ نے قائداعظم کو مسئلہ فلسطین پر ایک خط لکھا جس میں یہ بتایا کہ رابطہ عوام کا یہ ایک نادر موقعہ ہے فلسطین کے مسئلہ پر لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر

کہ کوئی ایسی راہ تجویز کیجئے جس میں عوام بہت بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں" اسی خط میں لکھا:

"ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازہ پر ایک مغربی فوجی اڈے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے خطرہ ہے"

یہ علامہ کی بے مثال سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے اسرائیلی خطرہ کے مضمرات کو برسوں پہلے بھانپ لیا تھا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ خود علامہ تو شریک نہیں ہو سکے لیکن قائداعظم کو برابر خطوط کے ذریعہ اپنے تاثرات اور تجاویز سے مطلع کرتے رہے۔ [illegible] علامہ سر سکندر اور جناح میں جو معاہدہ ہوا اس کے نتائج اور خطروں سے وہ نجی خطوط میں قائداعظم کو آگاہ کرتے رہے۔ سر سکندر کا منشا یہ تھا کہ مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے عملاً ختم کر دیا جائے اس کا توڑ کرنے کے لیے انہوں نے اس معاہدہ یا میثاق کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ لیگ ایک آزاد وزندہ قومی ادارہ بن جائے۔

مسجد شہید گنج کا انہدام، حکومت کا تشدد، مسجد کی بازیابی کے لیے سول نافرمانی اور اس کے بعد عدالت عالیہ کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف صادر ہونا ایسے واقعات و حادثات اقبال کے لیے نہایت قلق کا باعث تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسجد کی بازیابی کے لیے تمام مسلمانانِ ہند مل کر کوشش کریں اور آل انڈیا مسلم لیگ اس معاملہ میں ان کی رہنمائی کرے۔ ایک روز انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا اگر آل انڈیا

مسلم لیگ مسجد کی بازیابی کے لیے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کرے گی تو میں سب سے پہلے اپنی جان قربان کروں گا۔"

ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری

علی گڑھ یونیورسٹی نے تو کئی سال پہلے مرحوم کو ڈاکٹریٹ پیش کر دی تھی ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی جوبلی کی تقریب میں علامہ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی اور آپ کی صحت کے پیشِ نظر آپ کو الہ آباد آنے کی زحمت بھی نہیں دی۔

گورنس کا تقرر

والدہ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ اپنے بچوں جاوید اور منیرہ کی تربیت کی طرف سے بہت فکر مند تھے ایک عرصے تک ایک صحیح اتالیق خاتون کی تلاش کے لیے تگ و دو کرتے رہے۔ آخر کار علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مشورے سے ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن اہلیہ کی بہن جو جرمن ہونے کے باوجود اسلامی معاشرت سے واقف تھیں اور اُردو بھی بول لیتی تھیں۔ جاوید اور منیرہ کی اتالیق (گورنس) مقرر کی گئی اس وقت جاوید کی عمر تقریباً تیرہ سال اور منیرہ کی قریباً سات سال ہو گی۔ یہ خاتون انتظام خانہ داری اور تربیت میں بے حد خوش سلیقہ اور منظم ثابت ہوئیں ان کے متعلق جاوید اقبال لکھتے ہیں اماں جان کی وفات کے کوئی دو ایک سال بعد منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے ابا جان نے ایک جرمن خاتون کو علی گڑھ سے بلوایا اور وہ ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ ہم انہیں آپا جان کہا کرتے ان دنوں ہماری گھریلو زندگی میں ایک

ترتیب سی آگئی۔ ہم سب اباجان سمیت دوپہر اور رات کا کھانا کھانے والے کمرہ میں کھایا کرتے۔ منیرہ اور آپا جان ہر شام آباجان کے پاس بیٹھا کرتیں آباجان جرمن زبان بخوبی جانتے تھے اس لیے آپا جان سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے اور منیرہ کو بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو۔ جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرتی اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

اسی سال علامہ نے اپنی وصیت لکھی اپنے عقیدے، جائیداد اور بچوں کی کفالت کے سلسلہ میں وضاحت سے لکھا۔ اور قانونی سرپرست مقرر کیے اس سے پہلے ۱۹۳۵ء میں بھی وہ ایک وصیت لکھ چکے تھے۔

یہ سب باتیں سیاسی، غیر سیاسی، ذاتی ۱۹۳۷ء کی ہیں لیکن ان کے دل کو ایک ہی لو لگی تھی۔ کہ روضہ مبارک کی زیارت کر سکیں۔ ۲، دسمبر ۱۹۳۷ء کو سید میران شاہ کو لکھا:

"کاش میں بھی آپ کے ساتھ حج پر جا سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ اور معلوم ہوتے ہیں میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور کے روضہ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں"

انہیں اس زیارت کا شوق ہی نہیں تھا وہ اس کا مصمم ارادہ بھی کر چکے تھے۔ بعض جہاز ران کمپنیوں سے خط و کتابت بھی ہو چکی تھی ان کے آخری مجموعہ کلام ارمغان حجاز کی متعدد نظموں اور رباعیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اپنے تصور میں حجاز کا سفر کر رہے ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ اصلی سفرنامہ حجاز تو وہ ہوگا جو حجاز سے واپسی پر لکھا جائے گا۔ سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ اس سلسلہ میں آخری اردو نظم جو کہی گئی۔ اس کی تاریخ ۷، فروری ۱۹۳۸ء ہے یہ چھ شعر کا ایک مختصر قطعہ ہے جس کا موضوع ہے

حضرت الزمان۔

سال نو کا ریڈیائی پیام

یکم جنوری ۱۹۳۸ کو علامہ کا سال نو کا جو پیغام نشر ہوا وہ یہ تھا:

آج زمان و مکان کی تمام پہنائیاں سمٹ رہی ہیں۔ لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ ہمیں نئے سال کی ابتداء اس دعا کے ساتھ کرنی چاہیے کہ خداوند حاکموں کو انسانیت اور نوع انسان کی محبت عطا فرمائے۔" علامہ کا اس وقت کی بین الاقوامی صورت حال پر یہ تبصرہ علامہ کی سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے۔ سال سوا سال بعد ہی جنگ عظیم کی شکل میں جو تباہ کن طوفان اُٹھا وہ ملوکیت کے جبر و استبداد ہی کے تصادم کا نتیجہ تھا۔

یوم اقبال

۹ جنوری ۱۹۳۸ کو انٹر کالجیٹ برادر ہڈ کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا۔ غالباً اسی دن اُنہیں سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد دکن کی طرف سے توشہ خانہ نظام کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور تواضع موصول ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ جو خط تھا اس کی عبارت کچھ اس قسم کی تھی کہ علامہ کی غیرت نے اسے قبول

کرنا گوارا نہیں کیا اور ایک قطعہ لکھ کر سر اکبر حیدری کو چیک واپس کر دیا۔ یہ قطعہ ان کے آخری مجموعہ کلام میں جو وفات کے بعد شائع ہوا شائع ہے اس کا آخری شعر ہے

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

جواہر لال نہرو سے ملاقات

سید نذیر نیازی نے ۲۴ جنوری ۱۹۳۸ء کی ڈائری میں لکھا ہے کہ علامہ نے انہیں بتایا کہ چند دن ہوتے ڈاکٹر چکرورتی کے واسطہ سے جواہر لال نہرو ان سے ملنے آئے تھے۔ نہرو کے ساتھ میاں افتخار الدین بھی تھے۔ پنڈت نہرو کی گفتگو سے علامہ نے یہ تاثر اخذ کیا کہ وہ آزادی سے زیادہ انتقال اختیارات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن خود پنڈت نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے علامہ نے انہیں ملنے کو بلایا تھا اور جیسے وہ بعض اختلافات کے باوجود ان کے بہت سے خیالات سے متفق تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق میاں افتخار الدین نے نہرو کے ایما سے، کچھ اس طرح بات کی "ڈاکٹر صاحب آپ مسلمانوں کے مسلمہ اور متفقہ رہنما ہیں۔ آپ ان کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان تو مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بستر پر نیم دراز تھے یہ سنتے ہوئے اٹھ کے بیٹھ گئے۔ غصہ سے سرخ ہو کر انگریزی میں کہا:

"اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلہ میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔

اور میں تو ان کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں" یہ واقعہ غالباً جنوری ۳۸ء کے دوسرے ہفتہ کا ہے۔ سید نذیر نیازی نے "اقبال کے حضور" جو کتاب لکھی ہے اس میں علامہ کی ان دونوں سے گفتگو اور بحث کا حال لکھا ہے۔ اس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ صرف علامہ کا ذہن بیدار تھا۔ لیکن جہاں تک جسم کا تعلق ہے دم واپسین کی صورت تھی۔"

آخری علالت

جنوری ۱۹۳۸ء کے اواخر سے علامہ کی علالت نے تشویشناک صورت اختیار کرلی۔ اس زمانے میں حکیم محمد حسن قرشی ان کا علاج کر رہے تھے علامہ کو دمے کے ہلکے دورے پڑنے شروع ہوئے۔ پچھلی رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ دو ایک دن نقرس (گنٹھیا) کی شکایت بھی رہی دمے کے لیے حکیم صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا۔ جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ ضعف قلب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے بھی تشخیص کی تائید کی۔ ان دنوں علامہ بستر پہ بیٹھ کر تکیہ اپنے آگے رکھوا لیتے اور اس پر اپنا سر ٹیک دیتے۔ ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء کو دمہ کا دوسرا دورہ پڑا۔ جوشاندہ پیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ پھر ڈاکٹری علاج شروع ہوا۔ جس میں دورے کو روکنے اور نیند لانے کی تدبیر کی جاتی تھی۔ چند روز ذرا آرام سے گزرے۔ ۳۰ مارچ کی شب کا ذکر ہے کہ علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہوئی۔ اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر گئے۔ دوسرے دن حکیم قرشی نے دیکھا تو کہا قلب بہت کمزور ہے۔ جگر اور گردے بھی ماؤف ہو چکے ہیں۔ اس حالت کے پیش نظر معالجوں اور نیازمند تیمارداروں کو یقین ہو گیا تھا اب وقت آخر قریب ہے۔ لیکن علامہ

کے ذہن و فکر کی قوتوں میں کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی۔ جوں ہی طبیعت بحال ہوتی اور تھکن دور ہوتی وہ بدستور سیاسیات یورپ ہندی مسلمانوں کے مستقبل و حال اور دوسرے علمی اور فلسفیانہ مسائل و مباحث پر گفتگو شروع کر دیتے۔ حکیم قرشی صاحب ان کی علالت کی نازک صورتِ حال کے پیش نظر اکثر رات گئے تک حاضر خدمت رہتے۔ خوشگوار دوائیں کھلاتے اور خوشگوار باتیں کرتے علامہ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ ڈاکٹر محمد یوسف ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر جمعیت سنگھ سے بھی کبھی کبھی مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن وہ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی و ناگواری سے بے حد گھبراتے تھے اور علاج جاری نہ رہ سکتا تھا۔ سب معالج متفق تھے کہ علامہ کا دل بڑھ گیا ہے۔ دل کے ٹھیک طرح سے کام نہ کرنے سے دمہ قلبی ہے۔ گردوں کی کیفیت سے حکیم صاحب کا خیال تھا کہ پیٹ میں پانی پڑ جانے (استسقا) کا اندیشہ ہے۔ ۱۷ مارچ سے حالت مزید بگڑنے لگی تو دن رات کی تیمارداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند ارادت مند خدمت گزار تقریباً تمام دن اور رات گئے تک حاضر خدمت رہتے۔ سب کو نظر آ رہا تھا کہ اب بات بگڑنے لگی ہے۔ ایک شام جب علامہ انتہائی درد و کرب کی حالت میں تھے تو علی بخش نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ نیاز مندوں نے اس کو تسلی دی تو فرمایا:

"رونے دیجئے تیس پینتیس برس کا ساتھ ہے جی ہلکا ہو جائے گا۔"

اپریل کی ۱۷-۱۸ تاریخ تھی احباب سے مختلف مسائل پر گفتگو کر رہے تھے کہ فارسی کی ایک رباعی لکھوائی۔ ان دنوں بھی مسلمانانِ عالم کے حالات، اسلامی ملکوں کے واقعات، وطنیت پرستی کی لعنت مسلمانوں کے ذہنی، اخلاقی انحطاط پر نہایت دردمندی سے اظہارِ تاسف فرماتے اور اکثر رونے لگتے۔ اشعار پڑھ کر بھی رقت طاری ہو جاتی

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق اس حد تک تھا کہ ذکرِ مبارک کے ساتھ ہی اشک بار ہو جاتے۔ اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرطِ ادب سے یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ کہ حضور کا اسمِ گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں۔ مرض الموت کی کیفیت یہ تھی کہ آخر استسقا ہوا چہرے اور پاؤں پر ورم آگیا پیٹھ اور کندھے میں شدید درد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے دیکھا تو مایوسی ظاہر کی۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے صرف تسلی کہنے کی کوشش کی تو علامہ نے فرمایا:

میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا۔

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

(مومن کا نشان یہ ہے کہ جب موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر تبسم ہوتا ہے) ۲۰ اپریل کو سہ پہر کے وقت علامہ پیٹھ کے درد کی وجہ سے بہت بے چین تھے کہ اتنے میں ان کے ایک پرانے ہم جماعت (جو ہائیڈل برگ جرمنی میں ان کے ہم سبق تھے) بیرن کھان فلٹ ہائم اتفاق سے ملاقات کو آنکلے ان کا ایک پارسی دوست بھی ساتھ تھا علامہ نے درد بھول کر ان سے خوب باتیں کیں اور تیس برس پہلے کی طالب علمی کی باتیں بڑے لطف سے یاد کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد کانگرس اور لیگ کی باتیں کیں۔

۱۹ اپریل کی شام سے بلغم میں کسی قدر خون آرہا تھا۔ ڈاکٹر امیر چند آگئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو چند ہدایات دے کر چلے گئے۔ اس کے بعد علامہ کو خیال آیا حکیم قرشی صاحب شام سے بھوکے بیٹھے ہیں اور کھانا نہیں کھایا۔ علامہ نے علی بخش سے کہا حکیم صاحب کو

بسکٹ کھلاؤ اور چائے دو، کچھ دیر کے بعد انگریزی دوا پی۔ اس کے پیتے ہی علامہ کا جی متلانے لگا۔ اس پر حکیم قرشی صاحب نے خمیرہ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک دی جس سے طبیعت بحال ہو گئی۔ ساڑھے بارہ بجے علامہ کو غنودگی آنے لگی تو تیمار دار احباب اُٹھ کر چلے گئے۔ علامہ کچھ دیر سوتے رہے رات کے پچھلے پہر بے چینی شروع ہوئی۔ اصرار کر کے حکیم قرشی صاحب کو بلوانے آدمی بھیجا تکلیف ہی کی حالت میں پھر اپنی رباعی پڑھی جو انہوں نے گذشتہ دسمبر میں کہی تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید	نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے	دگر دانائے راز آید کہ ناید

علامہ کے ہر وقت کے تیمار دار م۔ش کا بیان ہے کہ: علامہ جانتے تھے کہ ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ انہوں نے کئی بار کہا: اب مجھے زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا مشن مکمل کر لیا ہے۔

اس شام ان کی بچی منیرہ بار بار کمرے میں آتی تھی اور ان کی چارپائی پر چڑھ کے ضد کرتی تھی اور روتی تھی۔ علامہ نے کہا اپنے اندرونی جذبے اور احساس کی وجہ سے اُسے پتہ چل گیا ہے کہ اس کے باپ کی آج آخری رات ہے" علامہ کی دگرگوں حالت دیکھ کر ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بنایا گیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر ضمیر سنگھ، کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش اور ڈاکٹر یار محمد شامل تھے۔ اس بورڈ نے غروب آفتاب سے پہلے علامہ کا معائنہ کیا۔ اور کہا کہ صبح کمر کے درد کا باقاعدہ علاج شروع کیا جائے گا اور کہا کہ اگر رات کو درد بڑھ جائے تو علامہ کو ایک ٹیکہ لگا دیا جائے۔ ٹیکہ لگانے اور دوا دینے کے لیے ان کے ایک عزیز ڈاکٹر عبدالقیوم جاوید منزل ہی میں رہتے تھے رات کو جب تکلیف

بڑھ گئی میاں محمد شفیع (م۔ش) نے کہا کہ آپ ٹیکہ لگوالیں تو انہوں نے آہستہ سے جواب دیا میں ٹیکہ نہیں لگواؤں گا۔ کچھ دیر بعد (م۔ش) نے دوبارہ ٹیکہ لگوانے کے لیے کہا تو انہوں نے غصے سے انگریزی میں کہا۔ میں بیہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں موت کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس ٹیکے میں افیون ہوتی ہے جو آدمی کو بیہوش کر دیتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے آخر دم تک ٹیکہ نہیں لگوایا۔ صبح کے وقت جب تکلیف زیادہ ہونے لگی تو اصرار کر کے حکیم قرشی صاحب کو بلوایا۔ وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ پونے پانچ بجے کے قریب ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انہیں اینو فروٹ سالٹ کا گلاس دیا گیا اس میں بلبلے اٹھتے دیکھ کر کہنے لگے یہ تو بہت زیادہ ہے۔ پھر کہنے لگے، ٹھہرو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ فروٹ سالٹ پیتے ہی ان کے سینے میں درد ہونے لگا۔ انہوں نے سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کسی نے چھری مار دی ہے، پھر اللہ کہا اور اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کو ڈھلکنے لگا۔ علی بخش نے بڑھ کر سہارا دیا۔ سر خود بخود قبلہ رو ہو گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

علامہ کی زندگی کے آخری چند دنوں کی بعض روایتیں یوں ہیں کہ:

۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کی رات بڑی تکلیف سے گزری۔ انتہائی درد و کرب کی حالت میں پرانا ملازم علی بخش علامہ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ کسی نے اُسے روکا اور رونے سے منع کیا تو آپ نے فرمایا رونے دیجئے۔ تیس پینتیس برس کا ساتھ ہے جی ہلکا ہو جائے گا۔"

۱۸ اپریل کو پاؤں پر ورم آگیا اور جگر نے اپنا فعل سر انجام دینا کم کر دیا۔ ۱۹ اپریل کو بیماری نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ لاہور کے معروف ڈاکٹروں کا ایک بورڈ مقرر ہوا جس کی نگرانی میں آپ کا نئے سرے سے علاج شروع ہوا۔ سب

سے پہلے ایک انگریزی دوا پلائی گئی جس کے پیتے ہی آپ کا جی متلانے لگا اور ابکائیاں آنے لگیں۔ خفا ہو کر کہنے لگے یہ دوائیں غیر انسانی ہیں ان میں مریض کے ذوق کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس پر حکیم قرشی نے خمیرہ گاؤ زبان عنبری کی ایک خوراک کھلائی جس سے آپ کی طبیعت بحال ہو گئی۔ اس دوا کے تلخ تجربے کے بعد ارادہ ظاہر کیا کہ آئندہ انگریزی دوا ہرگز استعمال نہ کریں گے۔ اس طریق علاج کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ جدید میڈیکل سائنس زندگی کی سائنس نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہے"

۲۰ اپریل کو علامہ پیٹھ میں شدید درد کی وجہ سے بہت بے چین تھے۔ مرتضیٰ احمد خان میکش عیادت کے لیے آئے۔ عین اس وقت جاوید اقبال کمرہ میں آ گئے۔ علامہ نے جاوید سے کہا:

بیٹا تم میرے پاس آ کر بیٹھا کرو میں شاید چند روز کا مہمان ہوں حاضرین میں سے کسی نے کہا ابھی کم عمر ہے اس لیے آپ کی بیماری سے گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہے۔ اس پر علامہ نے فرمایا اسے ہر افتاد کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنا چاہیے

آخری رات کے متعلق جاوید اقبال "مے لالہ فام" میں لکھتے ہیں:

آخری رات ان کی چارپائی گول کمرہ میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرہ میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے پوچھا کون ہے میں نے جواب دیا میں جاوید ہوں"۔ ہنس پڑے اور بولے "جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں"۔ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری محمد حسین سے مخاطب ہوئے "چوہدری صاحب! اسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا "خطاب بہ جاوید ضرور پڑھوا دیجئے گا"۔ اس دعا کا مفہوم ہے عصر حاضر میں قحط الرجال ہے اور مردان باخدا کا ملنا سخت محال ہے اگر

تمہاری قسمت اچھی ہوئی تو تمہیں کوئی صاحب نظر مل جائے گا اور اگر نہ ملا تو تم میری [illegible] پر عمل کرنا)

ڈاکٹر جاوید اقبال اس سلسلہ میں مزید لکھتے ہیں :

اس رات ہمارے گھر میں بہت سے ڈاکٹر آئے تھے ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا آج کی رات مشکل سے کٹے گی۔ کوٹھی کے صحن میں کئی جگہوں پہ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں لوگ کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ابا جان سے ڈاکٹروں کی یہ رائے مخفی رکھی گئی۔ مگر وہ بڑے تیز فہم تھے انہیں اپنے احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ اب بساط اُلٹنے والی ہے اس کے باوجود وہ اس رات افسردہ نہیں تھے"

ڈاکٹر عبدالقیوم آخری رات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "رات کے بارہ بجے تک کافی لوگ وہاں موجود تھے اور باتیں ہو رہی تھیں لیکن مرحوم زیادہ تر خاموش رہے۔ صرف ہوں ہاں ہی میں کسی کسی بات کا جواب دیتے۔ ہاں جس چیز کا انہوں نے اس رات ذکر کیا وہ پنجابی کی کوئی نعت تھی جو انہوں نے کبھی سُنی تھی۔ اس کے متعلق ان کا فرمانا تھا کہ ایسی نعت انہوں نے اُردو فارسی عربی میں نہ تو کہیں پڑھی ہے اور نہ کبھی سُنی ہے وہ اپنے احباب سے اس نعت کی تعریفیں کرتے رہے کہ پنجابی کی وہ نعت اس قدر بلند پایہ ہے کہ اپنی ساری زندگی میں کوشش کے باوجود وہ خود بھی اس کے ہم پلہ کوئی نعت نہیں کہہ سکے"۔

ایک بجے تمام احباب اُٹھ کر چلے گئے اس رات علامہ کا بستر پورچ میں لگایا گیا تھا۔ آپ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ تین بجے آپ نے راجہ حسن اختر کو بلایا اور اپنے ملازم دیوان علی سے کہا کہ وہ سو جائے البتہ علی بخش کو جاگتے رہنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد

راجہ حسن اختر صاحب سے فرمائش کی کہ "قرآن پاک کا کوئی قصہ پڑھ کر سناؤ یا کوئی حدیث بھی یاد ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ راجہ حسن اختر حکیم قرشی کو بلانے چلے گئے۔ ہوا میں خنکی بڑھی تو فرمایا: مجھے اندر کمرے میں لے جاؤ چنانچہ ۵ بجے کے قریب ان کی چارپائی ان کے کمرہ خاص میں لے جائی گئی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے فروٹ سالٹ تیار کیا بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ فرمانے لگے۔ اتنا بڑا گلاس کیسے پیوں گا؟ پھر سارا گلاس پی لیا۔ اس دوران میں علی بخش نے چوکی پلنگ کے قریب لگا دی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم باہر برآمدہ میں آ کر لیٹ گئے علی بخش کمرہ میں موجود رہا۔ اتنے میں کندھوں میں درد ہونے لگا تو علامہ نے علی بخش سے کندھے دبانے کے لیے کہا۔ پھر اچانک لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا دیے اُوپر کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بایاں ہاتھ دل پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا یا اللہ یہاں درد ہے"! اس کے ساتھ ہی آنکھیں بند ہو گئیں۔ علی بخش نے ڈاکٹر عبدالقیوم کو آواز دی وہ بھاگ کر اندر پہنچے دیکھا تو گردن ڈھلک کر چہرہ خود بخود قبلہ رو ہو گیا تھا ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

ڈاکٹر عبدالقیوم نے نبض ٹٹولی اور مایوس ہو کر انا للہ پڑھا اور چہرے کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ علی بخش قدموں سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ عین اس وقت مسجدوں کے میناروں سے صبح کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

صبح کے سوا پانچ بجے تھے۔ اپریل کی ۲۱ تاریخ تھی اور پیر کا دن۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تدفین

علامہ کے انتقال کے بعد ان کے احباب، عمائدین اور نیازمندوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ علامہ کو دفن کہاں کیا جائے اس باب میں علامہ کی کوئی وصیت موجود نہیں تھی۔ علامہ کے مرتبہ، اسلام سے گہری وابستگی اور ان کی عظیم قومی و ملی خدمات کے پیش نظر سب کا ذہن سطوت عالمگیری کی یادگار، شاہی مسجد لاہور کی طرف منتقل ہوا۔ اب سوال یہ اُٹھا کہ وسیع و عریض شاہی مسجد میں کونسی جگہ منتخب کی جائے۔ علامہ کے پُرانے دوست اور معتمد چودھری محمد حسین اور چند دوسرے بزرگان کا خیال تھا کہ علامہ کو شاہی مسجد کے کسی حجرے میں دفن کیا جائے۔ لیکن بیشتر صاحب الرائے حضرات نے حجرے کے بجائے شاہی مسجد ہی میں کوئی اور جگہ تلاش کرنے پر زور دیا چنانچہ علامہ کے خاص دوستوں اور نیازمندوں پر مشتمل ایک وفد نے شاہی مسجد جا کر رائے دی کہ بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے بائیں جانب جو قطعہ زمین خالی پڑا ہے اُسے علامہ کا مدفن بنایا جائے۔ اسی پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ اب مسئلہ مرکزی حکومت سے اجازت لینے کا تھا چونکہ یہ علاقہ محکمہ آثار قدیمہ کے زیر انتظام تھا۔ بہر حال بڑی تگ و دو کے بعد حکومت کی اجازت حاصل ہو گئی اور قبر کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا۔

نماز جنازہ علامہ کے انتقال کی خبر صبح سویرے ہی ریڈیو کے ذریعے پھیل گئی۔ سہ پہر

تک ہر فرقہ، ہر طبقہ اور ہر مرتبہ کے ہزاروں افراد نے جاوید منزل کی پورچ میں رکھے علامہ کے جسدِ خاکی کا آخری دیدار کیا۔ علامہ کی رحلت غیر متوقع نہیں تھی لیکن پھر بھی رحلت کی خبر سارے ملک پر خصوصاً مسلمانوں پر بجلی بن کر گری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا لاہور اشکبار ہے۔ شام کے پانچ بجے چھوٹے بڑے ہزاروں افراد کی موجودگی میں جاوید منزل سے جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دیے گئے تھے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں۔ مسلمانوں کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کے دستے اپنی اپنی وردیوں میں ساتھ تھے۔ جاوید منزل سے یہ پر شکوہ جلوس ریلوے روڈ سے ہوتا ہُوا اسلامیہ کالج کے وسیع لان میں پہنچا۔ جہاں نماز جنازہ پڑھنے کے لیے کم و بیش ساٹھ ستر ہزار اہل ایمان جمع تھے۔ اس کے بعد جب جنازہ دہلی دروازہ کی طرف چلا تو اہل جلوس کی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ جن میں اچھی خاصی تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی بھی تھی۔ سات بجے کے بعد جلوس شاہی مسجد پہنچا۔ نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد اتنی ہو چکی تھی کہ وضو کرنے اور صفیں باندھنے ہی میں مزید ایک گھنٹہ صرف ہُوا۔ آٹھ بجے نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پونے نو بجے شب اس صدی کے مجدد اور اس عہد کے ایک بطل جلیل کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

مزار اقبال

مزار اقبال کی تعمیر کے لیے علامہ کے احباب مداحوں اور نیاز مندوں پر مشتمل ایک کمیٹی ۱۹۳۸ء ہی میں بنادی گئی تھی۔ تاہم مزار کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ء میں ہُوا۔ مزار کا نقشہ

حیدر آباد کے ممتاز ماہر تعمیر نواب زین یار جنگ نے بنایا۔ مزار پر نہ کوئی گنبد ہے نہ مینار۔ یہ سنگ سرخ سے بنی ہوئی ایک مختصر سی تعمیر ہے۔ سادہ مگر پر شکوہ اور علامہ کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ۔ مزار کے اندر کی لوح اور تعویذ حکومت افغانستان نے پیش کیا تھا۔ یہ تعویذ اور کتبہ دُنیا کے سب سے قیمتی پتھر کا بنا ہے۔ مزار کی تعمیر کی مہم فروری ۱۹۵۰ء میں شروع ہوئی۔

مزار کی چھت تمثیلی اشاریت کی حامل ہے اس کے وسط میں اسم "محمدؐ" کندہ ہے۔ چاروں گوشوں میں اقبال کا نام ہے۔ اس انداز میں کہ ہر نام کی ایک برقی لہر مرکز کی طرف مائل ہے۔ اس تمثیلی اشاریت سے یہ اظہار مقصود ہے کہ اقبال نے جس مرکز انوار سے اکتساب نور کیا ہے وہ ذات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور انہی کی الہامی تعلیمات کا پر تو اس کے کلام اور پیغام پر پڑا۔

مغربی دیوار پر خط کوفی میں قرآن حکیم کی وہ آیت کریمہ کندہ ہے جو علامہ مرحوم و مغفور کو بہت مرغوب تھی۔ کلمۃً طیبۃً کشجرۃٍ طیبۃٍ ...... مزار کے اندرونی چار دیواری پر کچھ فارسی کے اشعار خط نستعلیق میں مشہور خطاط ابن پروین رقم نے رقم کیے ہیں۔

طنزیہ ۔ طربیہ

نظموں غزلوں کا مجموعہ

ضمیریات

سیّد ضمیر جعفری

چھپ کر تیار ہے

بُک کارنر، فیصل چوک جہلم

باب دوم

شخصیّت و کردار

- سراپا
- اسلوبِ زندگی
- کردار کی جھلکیاں
- عشقِ رسول
- شعائرِ اسلام سے وابستگی
- اقبال بقول اقبال
- اقبال کی شگفتہ مزاجی

اقبال کے فارسی مجموعہ کلام "پیام مشرق" کی اشاعت کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان ملاقاتی مودودصابری سے (جو دور دراز سے شوق ملاقات لے کر آیا تھا) علامہ نے فرمایا" پیام مشرق والے جس اقبال سے تم ملنے آئے ہو وہ یہاں نہیں رہتا۔ یہاں تو سیالکوٹ والا اقبال رہتا ہے، اگر اس سے ملنا چاہتے ہو تو حاضر ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہر بڑے شاعر، فنکار اور مفکر کی اصل میں دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک فنی اور تخلیقی شخصیت، اور دوسری ایک عام گوشت پوست کے انسان کی شخصیت، فنی شخصیت تخلیق کرتی ہے اور اپنے ادراک واحساس اور شعور میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند ہوتی ہے۔"آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال ہیں" اسی شخصیت کے بارے میں کہا گیا ہے۔ یہ ایک طرح کے الہامی اثر کے تحت کام کرتی ہے۔ دوسری شخصیت، عام انسانوں کے سے خواص رکھتی ہے۔ وہی خوبیاں وہی خامیاں وہی عام باتیں، جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں۔ یہ کلیہ اقبال پر بھی صادق آتا ہے۔ اقبال بھی ایک نہیں دو تھے۔ ایک وہ جسے خود اقبال نے پیام مشرق والا اقبال کہا ہے۔ مفکر، اور الہامی شاعر، خبر میں، نظر میں یکتا، مرد خود آگاہ و خدامست، دوسرا وہ اقبال ہے جسے خود انہوں نے سیالکوٹ والا اقبال کہا۔ یعنی عام گھریلو انسان جیسے عام لوگ

ہوتے ہیں۔

شاعر اور مفکر اقبال اپنی نظم و نثر میں ملتا ہے۔ اصل اقبال وہی ہے۔ اس تخلیقی اقبال کو اس کی تخلیقات ہی میں ڈھونڈنا چاہیے۔ اس کا جلوہ وہیں نظر آسکتا ہے۔ لیکن سیالکوٹ والے اقبال کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ پیام مشرق والے اقبال کو بھی اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سیالکوٹی اقبال سے خوب واقف ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جس سے عقیدت اور محبت ہو وہ اس کی زندگی کے ہر پہلو تک پہنچنا اور پرکھنا چاہتا ہے۔ یہی خاطر مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے ہیرو کو بحیثیت انسان بھی، ہر رنگ میں اور ہر پہلو سے دیکھیں گے۔ چنانچہ اس باب میں اقبال کی شخصیت کے ان تمام انسانی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تصویر کے نقوش ... روایات اقبال۔ اقبال درون خانہ۔ حیات اقبال۔ ذکر اقبال۔ اوراق گم گشتہ۔ اقبال کے حضور اور اقبال کی صحبت میں نامی کتابوں سے لے کر مرتب کئے گئے ہیں۔

سراپا

علامہ نہ کشیدہ قامت تھے نہ میانہ قد کے کچھ درمیانی کیفیت تھی۔ ڈیل ڈول بھرا بھرا تھا مگر فربہی کے عیب سے پاک۔ سفید، سرخی مائل رنگت، پیشانی اگرچہ کشادہ تھی مگر جہاں سر کے بال شروع ہوتے تھے وہاں کچھ تنگ بلکہ ایک گوشہ بنائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ابرو بہت گھنے تھے اور کچھ اس قدر نیچے اور زیادہ گھنے معلوم ہوتے تھے کہ ان کے نیچے آنکھیں گہری بلکہ قدرے کو دبی ہوئی تھیں۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں لیکن گمبھیر اور

چمکدار تھیں۔ گفتگو کرتے وقت صرف دائیں آنکھ کھلی رہتی تھی۔ دوسری آنکھ نادانستہ طور پر ذرا بند کرتے رہتے تھے (دراصل یہ آنکھ بچپن ہی میں بینائی سے محروم ہو چکی تھی) سر کے بالوں میں باقاعدہ مانگ نکالنے کی عادت نہیں تھی۔ صرف کنگھے سے سلجھا کر پیچھے کی طرف لوٹ لیتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنا ہاتھ اسی انداز سے بالوں پر پھیر لیا کرتے تھے۔ ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ لیکن مونچھیں رکھتے تھے۔ مونچھیں ذرا چھدری تھیں اور قدرے باریک۔

علامہ کی شخصیت کا مجموعی تاثر بقول پروفیسر حمید احمد خان، غور و فکر کا تھا۔ خاموشی اور گفتگو، سکون اور اضطراب، ہر حالت میں غور و فکر کا تاثر قائم رہتا تھا۔

علامہ کے بیٹھنے کا انداز

آرام کرسی پر بے تکلفی سے ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھتے اور کبھی کبھی اپنے پاؤں کے بے حد سفید تلوے کو سہلا لیتے اور کرسی کے قریب پڑے ہوئے معمولی سے حقے کے دو ایک کش لے لیتے۔

سونے کا انداز

اقبال درون خانہ کے مصنف کا بیان ہے کہ انہیں سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر کے ایک طرف لیٹنے کی عادت تھی اور سوتے میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ ان کی نیند اطمینان کی [illegible] خراٹوں کی آوازیں آنی شروع ہو جاتیں انہیں سوتے میں خراٹے لینے کی عادت تھی۔

جاگنے اور سونے کے اوقات

انہیں رات کو دیر سے سونے کی عادت تھی دس گیارہ بجے تک محفل برخاست ہونے کے بعد کچھ دیر مطالعہ فرماتے یا حقہ منہ میں دبائے خاموش گہری سوچوں میں گم رہتے۔ اکثر نماز عشاء ادا کر کے دیر سے سوتے مگر پھر بھی علی الصبح اُٹھ جاتے۔ کبھی کبھی تہجد بھی ادا کرتے فجر کے بعد حسب معمول بڑی خوش الحانی سے تلاوت قرآن پاک کرنا ان کا معمول تھا ان کی سحر خیزی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ذاتی خدمت گزار (علی بخش) کو فجر کی نماز کے لیے وضو کے پانی اور جائے نماز کا اہتمام رات کو سونے سے پہلے ہی کرنا پڑتا۔ کیونکہ فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرنا ان کا معمول تھا۔

خوراک

نوجوانی کے بعد ڈاکٹر صاحب کو عمدہ قسم کے کھانوں اور زبان کے چٹخاروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ علی بخش ایک سالن اور دو پھلکے پکا دیتا عام طور پر دوپہر کو کھانا کھاتے رات کو ناغہ کرتے تھے۔ لیکن جس دن اتفاق سے دوپہر کا کھانا نہ کھاتے اس دن رات کا کھانا کھاتے۔ ان کا دن رات میں ایک بار کھانے کا معمول ایک دو سال نہیں ۲۰۔۲۵ سال قائم رہا۔ جب تک اندرون بھاٹی گیٹ ان کا قیام رہا۔ رات کو عموماً دودھ پی لیا کرتے تھے بعد میں یہ معمول بھی منقطع ہو گیا۔ پھلوں میں انگور، آم، سردہ، خربوزہ شوق سے کھاتے تھے۔

کھانے کی عادات کھانے کے معاملے میں وہ سادہ مزاج ضرور تھے لیکن نفاست

پسند بہت تھے ویسے جو کچھ کھانے کو مل جاتا بہ رضا و رغبت کھا لیتے کبھی کسی چیز میں نقص نکالتے۔ البتہ اچھے کھانے کی تعریف ضرور کرتے لیکن جو چیز آنکھوں کو اچھی معلوم نہ ہوتی۔ اسے کھانے سے انکار کر دیتے۔ اِن کی بھتیجی سے روایت ہے کہ ایک روز ہنڈیا بھوننے میں زیادہ سُرخ ہو گئی جس کی وجہ سے سالن ذرا سیاہی مائل ہو گیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اس پر ان کی اہلیہ (سردار بیگم) نے کہا کہ "مزے دار تو بہت ہے" اس دلیل کا جواب انہوں نے یوں دیا "جو چیز دیکھنے میں اچھی معلوم نہیں ہوتی اس کے مزے دار ہونے سے کیا فائدہ؟ پکی ہوئی کلیجی، یا مغز۔ کھانا تو بڑی بات ہے اُسے دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک دفعہ بیماری کے دوران حکیم نابینا صاحب نے انہیں بکرے کا مغز بھون کر کھانے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا، فرمایا: "مغز کھانا تو ایک طرف مغز دیکھ کر ہی میری طبیعت متلانے لگتی ہے" ترش، چٹ پٹے، اور مرغن کھانے انہیں بہت مرغوب تھے۔ نمک مرچ تیز پسند کرتے تھے۔ کھانے کے بعد میٹھا ضرور کھاتے ان کی اہلیہ دُودھ اور سویوں کی کھیر التزام سے پکا کر رکھتیں۔ جسے وہ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ عید کے دن ہمیشہ سویوں پر دہی ڈال کر کھاتے تھے اور فرماتے کہ یہ میری والدہ کی پسند ہے ہر قسم کا اچار انہیں بہت پسند تھا خاص طور پر شلغم کا اچار بہت مرغوب تھا۔ فرمایا کرتے اچار شلغم ایک نعمت ہے۔ آم کا اچار جب ڈالا جاتا تو خاص طور پر ان کی ہدایت ہوتی کہ آم کی گٹھلی کے اندر کا گودا بھی اچار میں رہنے دیا جائے اچار کی پھانک کے ساتھ گودا بھی بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ خُشکہ ان کی طبیعت کو راس نہیں آتا تھا اس لیے عام طور پر روٹی ہی کھاتے۔ شب دیگ کے بہت شوقین تھے اور شب دیگ ہمیشہ خشکے کے ساتھ کھاتے تھے۔

میٹھی چیزیں انہیں بہت پسند تھیں۔ یہاں تک کہ دوا بھی میٹھی ہی پسند کرتے تھے۔ جب کبھی دوا کی ضرورت محسوس ہوتی تو حکیم نابینا صاحب یا کسی دوسرے حکیم سے رجوع کرتے تاکہ کسی میٹھی معجون یا خمیرے ہی سے کام چل جائے۔ خمیرہ گاؤزبان ان کی پسندیدہ دوا تھی۔ کڑوی کسیلی دوا پینا ان کے لیے انتہائی مشکل ہوتا۔ حتیٰ کہ کسی دوسرے کو بھی خاموشی اور آرام سے کڑوی دوا پیتے دیکھ کر بہت حیران ہوتے۔

پسندیدہ کھاجا

آپ ریوڑیاں، کشمش اور اخروٹ کے مغز ملا کر بڑے شوق سے کھاتے سیالکوٹ کے قیام کے دوران اس کھاجے سے ہر روز شغل فرماتے۔

وہ کھانا ہمیشہ قلیل مقدار میں کھاتے تھے۔ صبح ہلکا سا ناشتہ دوپہر کے وقت کبھی تھوڑا سا پلاؤ یا ایک ڈیڑھ خمیری روٹی اور رات کو مکمل فاقہ۔ البتہ رات کو نو دس بجے کے قریب دو خطائیاں اور نمکین کشمیری چائے کی ایک پیالی پیتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ پانی بہت کم پیتے لیکن کھانے کے بعد ایک پیالی چائے پینا پسند کرتے گوشت سے رغبت زیادہ تھی لیکن ہر قسم کی سبزیوں سے بھی عار نہ تھا۔ پلاؤ اور شامی کباب ان کے پسندیدہ کھانے تھے فرمایا کرتے تھے یہ اسلامی کھانے ہیں۔ سیخ کباب بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ انہیں نئی نئی قسم کے کھانے پکوانے اور آزمانے کا بھی شوق تھا۔ ان کی اہلیہ نے ان کی اس قسم کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں خاصا ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ ایک دفعہ کہیں سے انہیں ٹماٹروں کے رس میں پلاؤ پکانے کی ترکیب معلوم ہوئی۔ اس کے مطابق ان کی بیگم نے ٹماٹر پلاؤ بنایا۔ جو انہیں بہت پسند آیا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی

قسم کے پلاؤ کی فرمائش کرتے اور بڑے شوق سے کھاتے۔

آخر میں معالجین کے اصرار پر رات کے کھانے پر انہوں نے مرغ مسلّم لینا شروع کیا تھا لیکن عادت نہ ہونے کی وجہ سے بات نہ بنی تو مرغ دوپہر کے کھانے میں شامل کر دیا اور رات کو تھوڑا سا دلیہ یا کھچڑی کھانے لگے۔

پسندیدہ پھل

آم ان کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی آم کھانا نہیں چھوڑتے تھے۔ یوں بھی پرہیز کے وہ زیادہ قائل نہیں تھے۔ آموں کے موسم میں تقریباً وہ ہر روز آم کھاتے تھے۔ تحفے تحائف کے طور پر بھی بے انتہا آم آتے تھے۔ ایک سے ایک اعلیٰ قسم کے۔ خود بھی کھاتے اور دوست احباب کو کھلا کر اس سے زیادہ خوش ہوتے آموں کی تعریف کرنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ کہا کرتے قدرت نے میووں کو ترقی دے کر انگور بنائے اور انگوروں میں جو کمی رہ گئی وہ آموں کی تخلیق میں پوری کر دی۔

لباس

علامہ لاہور کی طالب علمی اور پروفیسری اور ب کے زمانے میں خوش لباس بھی تھے۔ اچھا پہنتے تھے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ لیکن وہ جسے بننے کا ذوق اور شوق کہتے ہیں وہ انہیں عمر کے کسی دور میں بھی نہیں تھا۔ یورپ سے آنے کے بعد رفتہ رفتہ کپڑوں اور رہن سہن کے تکلفات سے ان کی بے نیازی بڑھتی گئی ۱۹۲۲ء تک وہ انارکلی کے بالاخانے پر رہے۔ اس وقت تک کپڑوں اور رہنے

کی ظاہر داری کا تھوڑا بہت خیال تھا۔ منٹو روڈ کی کوٹھی میں منتقل ہوتے ہی ان کی طبیعت میں اس طرف سے خاصی لاپرواہی آگئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں میو روڈ کی جاوید منزل میں جاتے ہی اور والدہ جاوید کے انتقال کے بعد سے تو وہ بالکل درویش ہو گئے تھے۔ نہ کمرہ کی پرواہ، نہ مسہری اور بستر کی۔ دیواریں خاک آلود، معمولی فرنیچر، اس پر کتابیں بے ترتیبی سے بکھری ہوتی، کمرہ کا مجموعی تاثر پریشانی اور خستہ حالی کا ہوتا تھا۔ علامہ کے لباس کے بارے میں فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بس ضرورت کے مطابق کپڑے سلواتے تھے نہ فالتو جوڑے رکھتے تھے اور نہ نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے خریدنے کا انہیں کوئی شوق تھا۔ ہوتا یہ کہ جب کپڑے ختم ہو جاتے تو علی بخش سے ذکر کر دیتے۔ علی بخش ایک ان پڑھ اور پرانی وضع کا سیدھا سادہ ملازم تھا وہ اپنی پسند کا کپڑا بازار سے جا کر خریدتا اور درزی کے سپرد کر آتا کبھی اس درزی ہی سے کہہ دیا جاتا جس کے پاس ان کا ناپ موجود تھا اور درزی کپڑے تیار کر کے پہنچا دیتا۔ ڈاکٹر صاحب کسی کپڑے کی وضع قطع، تراش، سلائی پر کوئی اعتراض نہ کرتے اور نہ کسی قسم کی تنقید فرماتے، اول تو دھوتی اور بنیان کی موجودگی میں کپڑے پہننے کی نوبت ہی کم آتی تھی۔ گھر پر شلوار صرف سردیوں میں پہنتے۔ گرمیوں میں ہمیشہ پانچ گز کی کنی دار دھوتی کو دھرا کر کے باندھ لیتے۔ جاڑوں میں قمیض اس پر دھسا یا گرم چادر"۔ اس موضوع پر علامہ کے ایک شاگرد، میاں عطاء الرحمٰن لکھتے ہیں"۔ علامہ نے لباس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج اور ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا۔ بغیر استری کے، ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی، عام طور پر کالر پر بندھی بندھائی لو چپکا لیا کرتے تھے۔

بوٹ میلے ہیں تو پرواہ نہیں ۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے ۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی ۔

اس سلسلہ میں خواجہ عبدالوحید نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے :۔

(۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک) علی لاج کی محفلوں میں علامہ شلوار اور کوٹ میں ملبوس ہوتے تھے ۔ سر پر پگڑی باندھتے تھے جو اکثر پنجابی لنگی ہوتی تھی ۔ آپ کالر اور ٹائی کا استعمال بھی کرتے تھے کالر ہمیشہ اکڑا ہوتا تھا جس کے اوپر ٹائی پوری نظر آتی تھی ، ہاتھ میں چھڑی ضرور رکھتے تھے ۔

عمر کے آخری دور میں علامہ نصف آستین کی بنیان اور لٹھے کا تہمد باندھتے تھے عموماً پلنگ پر بیٹھتے بلکہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز لیٹے رہتے تھے ۔ سردی میں سفید کپڑے کی قمیض شلوار اور گہرے بادامی رنگ کا دھسا کندھوں پر ڈال لیتے ۔ وہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے اسی عالم میں اس دھج کے ساتھ ملتے تھے ۔ اوائل مئی ۱۹۳۶ء میں جب قائداعظم ملنے آئے تو وہ بنیان دھوتی میں اسی شان سے بیٹھے تھے اور حقہ سامنے رکھا تھا ۔ صرف محترمہ فاطمہ جناح کی رعایت سے جلدی سے قمیض گلے میں ڈال لی تھی ۔ اسی موقعہ پر علامہ اقبال نے قائداعظم سے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے ۔ "میں آپ کے مشن کی کامیابی کے لیے اپنے لہو کا آخری قطرہ نچوڑ دوں گا ۔" اور جب فروری ۱۹۳۸ء میں میاں افتخارالدین کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو علامہ سے ملنے آئے تو وہ اسی طرح پلنگ پر دراز تھے اور پنڈت نہرو وغیرہ ان کے پلنگ کے ساتھ فرش پر بیٹھے تھے ۔

۱۹۳۷ء اپریل جب آخری بار علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں

شرکت کی تو ان کا لباس یہ تھا۔ بادامی شوز، بغیر پالش کے، تین گز کی لٹھے کی شلوار، ٹول کی سفید قمیض۔ گبرڈن کا کوٹ، اور لدھیانے کی نیلی سلائی دار پانچ گز کی سوتی پگڑی اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اصل میں علامہ فکر و فن اور اثبات خودی کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ہر ظاہر داری اور دنیا داری ہیچ اور بے معنی ہو جاتی ہے۔

علامہ کے لباس اور رہن سہن کے بارے میں علامہ کی بھتیجی کے بیٹے خالد نظیر صوفی لکھتے ہیں:

"اقبال انتہائی سادہ زندگی کے عادی تھے۔ خصوصاً لباس کے معاملے میں تو وہ لاپروائی کی حد تک سادگی روا رکھتے تھے گرمیوں میں گھر پر صرف دھوتی اور بازو والی بنیان پہنے رہتے اور اس میں بھی کوئی اہتمام نہ تھا۔ سردیوں میں اس لباس پر دو چیزوں کا اضافہ ہو جاتا۔ ایک تو گلے میں "ماسے" کا کھلا کرتا پہن لیتے دوسرے کندھوں پر دھسا ڈال لیتے۔ گھر پر پاؤں میں سلیپر کے بجائے سیاہ رنگ کا پمپ شو پہنتے جس کے اوپر "بو" لگی ہوتی تھی۔

جوانی میں انہیں شلوار قمیض پسند تھی۔ گرمیوں میں قمیض پر عام کوٹ لیکن سردیوں میں بند گلے کا فراک کوٹ پہنتے تھے اور سر پر سفید یا موتیے رنگ کی ململ کی پگڑی باندھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ترکی ٹوپی بھی پہننی شروع کر دی۔ انگریزی ٹوپی ہیٹ شاید ہی کبھی پہنتے تھے۔ ولایت جانے سے پیشتر انہوں نے کبھی انگریزی لباس نہیں پہنا۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد بھی وہ سوٹ وغیرہ اشد ضرورت کے وقت کچہری جاتے ہوئے یا کسی سرکاری تقریب میں شرکت کے لیے پہنتے تھے وہ بھی بادل نخواستہ۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ جیسا بھی کپڑا مل جاتا پہن لیتے۔ انہیں اس سے سروکار نہ تھا کہ کپڑا ریشمی ہے یا سوتی انہوں

نے کبھی اپنے لیے خاص طور سے کپڑے وغیرہ پسند نہیں کیے ان کی دوسری بیوی (سردار بیگم) جیسے کپڑے بنوا دیتیں بخوشی پہن لیتے۔ کپڑے کے معاملے میں پہچان کا یہ عالم تھا کہ انہیں اپنے برادر نسبتی (سردار بیگم کے بھائی) کی شادی کے موقعہ پر انہیں جو کپڑے ملے ان میں بوسکی کی قمیض تھی۔ ان کی بیگم نے قمیض دکھلاتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ بوسکی ہے وہ بڑے حیران ہوئے اور فرمایا: اچھا تو یہ بوسکی ہے لیکن اس میں کوئی خاص بات تو نظر نہیں آتی۔

ملاقات کا اسلوب

"آؤ جی....صاحب" جس کو اچھی طرح پہچانتے تھے اس کا خیر مقدم اسی جملے سے کرتے۔ جس شخص کو نہیں جانتے اس کے متعلق کبھی نہیں پوچھتے کہ یہ کون ہے۔ ناواقف لوگوں کے لیے یہی کافی تھا کہ سلام کریں اور بیٹھ جائیں اس کے بعد تکلف برطرف وہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں پوری آزادی سے شامل ہو جاتے تھے۔ علامہ سوالات کا جواب دینے سے نہیں تھکتے تھے بلکہ ایک ایک نکتہ کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ کچھ سمجھاتے تو ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہی نہیں بلکہ پورے ہاتھ کو اٹھاتے تھے۔

میو روڈ کی کوٹھی کے زمانے میں جب امراض نے آگھیرا تو گاؤ تکیے کے سہارے بستر پر لیٹے رہتے اور ملاقاتیوں کو خواب گاہ ہی میں بلا لیتے تھے۔ اسی حالت میں لیٹے لیٹے جوں ہی گفتگو میں ذرا گرمی پیدا ہوتی تو اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتے۔

گفتگو کا انداز

عام طور پر علامہ گفتگو پنجابی میں کرتے تھے دقیق اور فلسفیانہ مسائل پر اظہار خیال

کرتے وقت وہ اُردو یا انگریزی کو استعمال کرتے۔ گھر میں وہ ہمیشہ پنجابی میں بات چیت کرتے اور پنجابی بھی سیالکوٹ کے مخصوص محاورے اور تلفظ کے ساتھ بولنے پر بڑی سختی سے عمل پیرا تھے۔ فالودہ کو ہمیشہ پھلودہ بولتے۔ اگر اہلیہ (سردار بیگم) جو لاہوری تھیں فالودہ کہنے کے لیے کہتیں تو کہتے "میری ماں نے تو مجھے یہی سکھلایا ہے میں اپنی ماں کی تعلیم کو فراموش نہیں کر سکتا"۔

گفتگو کرتے وقت آواز بلند اور رعب دار ہوتی۔ دوران گفتگو میں وہ آنکھوں کو تھوڑا سا سکیڑ لیتے جب گفتگو میں شدت پیدا ہوتی تو آنکھیں پوری طرح کھل جاتیں۔ چہرہ جلال اور جوش سے سُرخ ہو جاتا۔

شعر گوئی کا انداز

علامہ کی شعر گوئی آورد نہیں آمد کا نتیجہ ہوتی تھی۔ آمد سے پہلے محویت و استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر وہ یکایک چونک پڑتے یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ نزول شعر شروع ہونے والا ہے۔ رات کے پچھلے پہر یہ کیفیت طاری ہوتی تو علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اپنی بیاض اور قلم لانے کو کہتے اور اشعار قلم بند کرنے میں معروف ہو جاتے اس لمحے یوں لگتا جیسے خُدا سے ہم کلام ہوں اور بقول علی بخش سچ تو یہ ہے کہ وہ خُدا سے باتیں کرتے تھے"۔ جب آمد کا عالم ہوتا تو ایک دن میں سینکڑوں اشعار کہہ ڈالتے اور کبھی مہینوں کچھ نہ کہتے کب اور کس وقت آمد شروع ہو جاتے انہیں خود معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے عام طور پر وہ اپنے تکیے کے نیچے کاغذ پنسل رکھ کر سوتے تھے اگر رات کے وقت اشعار کا نزول شروع ہوتا تو ہر شعر کے چند ابتدائی الفاظ کاغذ پر لکھ لیتے

اور صبح بستر سے اُٹھنے کے بعد انہیں مکمل کر لیتے۔ خود فرماتے ہیں:

"میں نے ایک رات میں زیادہ سے زیادہ تین سو اشعار کہے ہیں۔"

کیفیت شعر

کسی نے علامہ سے استفسار کیا آپ پر شعر کہنے کی کیفیت اکثر طاری ہوتی ہے فرمایا نہیں ایسی کیفیت سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار ہوتی ہے لیکن اس وقت مضامین کے ہجوم کی حالت وہی ہوتی ہے جیسے کسی ماہی گیر کے جال میں اس کثرت سے مچھلیاں پھنس جائیں کہ وہ پریشان ہو جائے اور سوچ میں پڑ جائے۔ کس کو پکڑ وں اور کس کو چھوڑ دوں۔ پھر فرمایا عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل مدت کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس سے پہلی کیفیت کے آخری لمحات میں جو اشعار کہے تھے ان کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ گویا الہام کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

شوق اور دلچسپیاں

قوالی اور موسیقی

قوالی اور موسیقی کا ذوق تھا۔ جوانی میں ستار بھی بڑی اچھی طرح بجاتے تھے۔

موسیقی سے دلچسپی

مرزا جلال الدین راوی ہیں کہ میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مذاق

شخص ملازم تھا اسے ستار بجانے میں خاصی مہارت تھی۔ وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز سے بجایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے روز اس سے مسدس حالی سننے کی خواہش کرتے۔

مسدس کا یہ بند:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

انہیں بطور خاص مرغوب تھا۔ اس کو سنتے ہی ان کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے۔ اسی طرح کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ اسی سلسلہ میں مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو راگ رنگ کا بہت شوق تھا میرے مکان پر رقص و سرود کی محفلیں اکثر ہوا کرتیں۔ اس لیے ان مجالس میں بڑی رغبت سے شمولیت فرماتے میں نے دیکھا کہ بعض اوقات رقص و سرود ہی کے دوران میں آپ اپنی کسی نظم کو بنیاد رکھ دیتے۔ گانا جاری ہوتا کہ اقبال کا قلب جذبات سے متاثر ہونے لگتا اور وہ دھیمے سروں میں گنگنانا شروع کر دیتے۔ جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے اور کیفیت کے آشکار ہوتے ہی ارباب نشاط کو فی الفور گانے سے روک لیا جاتا اور ہمہ تن گوش ہو کر اقبال کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی۔ سازندے جو اقبال کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے۔ نہایت مدھم سروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے رہتے جس کے ساتھ وہ اپنی مخصوص لے میں اپنے اشعار شروع کر دیتے۔ ان کی آواز سازوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے کچھ ایسی دلنواز ہو جاتی کہ ایک سماں بندھ جاتا۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

والی نظم کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی محفل میں رکھی گئی تھی۔ ملّی ترانے کا شعر

چین و عرب ہمارا سارا جہاں ہمارا

بھی اسی حالت میں موزوں ہوا تھا۔"

سگریٹ کا شوق

علامہ کے یارِ غار مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں کہ وکالت کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب قینچی مارکہ سگریٹ پیتے تھے۔ بار روم میں وہ سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لطائف و ظرائف سے محفل کو زعفران زار بنا تے۔

حقّہ

علامہ کے بھتیجے اعجاز احمد نے بھی ان کے ایک سفر میں سگریٹ پینے اور ایک عقیدت مند ہم سفر کو سگریٹ پیش کرنے کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن وہ عموماً حقہ ہی پیا کرتے تھے اور حقے کے بہت زیادہ عادی ہو گئے تھے۔ بغیر حقہ پیئے انہیں چین نہیں آتا تھا اور جب حقہ کی طلب ہوتی تھی تو ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ "روزگار فقیر" میں ایک ایسے واقعہ کا تذکرہ ہے کہ ایک سفر کے دوران انہیں حقے کی ایسی طلب ہوئی کہ ایک قلی سے ایک ٹوٹا پھوٹا اور گندہ سا حقّہ منگوا کر پیا۔ بعد کو خود بھی افسوس کا اظہار کیا کہ حقہ کی طلب کی خاطر انہیں ایسا حقّہ پینا پڑا۔

گھر میں حقہ کی صورت یہ تھی کہ ایک اوسط درجہ کا حقہ پلنگ یا کرسی کے پاس پڑا

رہتا علی بخش کا خاص کام ہی یہ تھا کہ چلم بھرتا رہے اور حقہ کو تازہ رکھے۔ کسی کسی وقت حقہ کے ایک دو کش لگا لیتے بار بار کش لگانے کی عادت نہیں تھی۔ اگر محفل میں کوئی اور بھی حقہ پینے والا ہوتا تو نے خود ہی اس کی طرف بڑھا دیتے۔

کبوتر

اقبال کے بچپن کے زمانے میں سیالکوٹ کے محلہ کشمیریاں میں کبوتر پالنے اور اُڑانے کا شوق عروج پر تھا۔ دیکھا دیکھی اقبال بھی کبوتروں میں دلچسپی لینے لگے۔ میاں جی (شیخ نور محمد۔ اقبال کے والد ماجد) نے ان کا شوق دیکھ کر انہیں گھر پر ہی کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی وہ کبوتر اڑاتے اور گھنٹوں خاموش بیٹھے ان کی اڑان کے مزے لیتے۔ کبوتروں کا شوق انہیں کافی عرصہ تک رہا لاہور میں انارکلی والے گھر میں بھی ان کے پاس کبوتر تھے۔ پھر جب میکلوڈ روڈ پر منتقل ہوتے تو کبوتروں کے لیے خاص ڈربے بنوائے۔ لیکن جب جاوید اقبال پیدا ہوئے تو انہوں نے یہ شوق ختم کر دیا۔ کبوتروں سے ان کے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی وہ چھت پر یا صحن میں لیٹے ہوتے تو دور اُڑتے کبوتروں کو فوراً پہچان لیتے کہ یہ کونسی قسم ہے اور کونسی نسل۔

ورزش

اپنی عمر کے آخری دور میں علامہ گھر سے بہت کم نکلتے تھے۔ وہ بھی اشد ضرورت میں گھر میں بھی چلت پھرت زیادہ نہیں تھی۔ بہت ہوا تو برآمدے یا صحن میں دو چار چکر لگا لیے۔ ورنہ زیادہ وقت آرام کرسی پر یا پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے۔ نیم دراز لیٹے

گزرتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ جانے سے پہلے جس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے میں رہتے تھے انہیں جسمانی ورزش سے خاصا شغف تھا ان کے اس وقت کے خدمت گزار علی بخش کا بیان ہے وہ بھاٹی دروازے والے مکان میں اکثر صبح سویرے اُٹھ کر ڈنٹر پیلتے تھے۔ کبھی کبھی مگدر بھی ہلاتے تھے۔ علامہ کے ایک حاضر باش ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی تصدیق کی ہے کہ علامہ اس زمانے میں کبھی کبھی اپنے دوست میر غلام بھیک نیرنگ کے ساتھ اکھاڑے میں لنگوٹ باندھ کر اترتے تھے اور زور کرتے تھے یہ گھریلو اکھاڑہ لاہور کے کوچہ ہنومان گُمٹی بازار میں واقع تھا کشتی کو وہ مردانہ کھیل کہتے تھے اور نوجوانوں کو زور کرنے اور جسم بنانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

موسموں کا احساس

گرمی کے مقابلے میں سردی کا احساس انہیں زیادہ ہوتا تھا۔ گرمیوں میں عام طور پر بغیر پنکھے کے بیٹھے رہتے لیکن سردیوں میں جہاں بیٹھتے کوئلوں کی انگیٹھی قریب رکھواتے۔

ناپسندیدہ اشغال

شعر سنانے سے اجتناب

نہ مشاعروں میں جاتے تھے نہ نجی محفلوں میں شعر سنتے سُناتے تھے۔ اس سلسلہ میں بڑوں بڑوں کے اصرار کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ دہرہ دون میں نواب صاحب رام پور کی دعوت اس شرط پر قبول کی کہ انہیں شعر سُنانے کے لیے نہ کہا جائے۔ حیدر آباد میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی دعوت میں بھی جس میں حیدر آباد کے عمائدین مدعو تھے اسی شرط پر

شریک ہوئے کہ شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے۔

فلم دیکھنے سے نفرت

ان کی بھانجی وسیمہ مبارک کی روایت ہے کہ فلم دیکھنے کے بہت خلاف تھے انہوں نے شاید ایک بار کے سوا کبھی فلم نہیں دیکھی اور نہ ہی گھر میں سے کسی کو سینما جانے کی اجازت تھی۔ حالانکہ ان کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے قریب ہی سینما تھا۔ ایک دفعہ جاوید ضد کرکے گھریلو ملازم کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا اس وقت اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پانچ چھ برس کی ہوگی۔ ابھی آدھا ہی وقت گزرا ہوگا کہ انہیں اس بات کا علم ہوگیا اور انہوں نے اسی وقت دوسرے ملازم کو بھیج کر انہیں واپس بلا لیا اور اس ملازم کو جو جاوید کو فلم دکھانے لے گیا تھا بڑی سختی کے ساتھ آئندہ ایسا کرنے سے منع کیا وہ گھر پر ریڈیو یا گراموفون بجانا تک پسند نہیں کرتے تھے۔

کردار کی جھلکیاں

اقبال نے اپنے کلام میں جس مثالی انسان کی تصویر پیش کی ہے اس کے پیش نظر بعض لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ خود انہیں بھی اس آئیڈیل پر پورا اترنا چاہیے تھا اور پھر چونکہ بعض اشعار میں اقبال نے خود پر بھی تنقید کی ہے جیسے:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اس سے بعض اوقات یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ان کے قول اور فعل میں بڑا تضاد تھا۔ یہ مسئلہ ان کی زندگی میں بھی اٹھا تھا۔ ایک دفعہ بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں حاضر

ہوا۔ دوران گفتگو وفد کے رکن نے گلہ سا کیا۔ آپ کی تعلیمات نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا ہے۔ لیکن آپ نے خود نمونہ عمل پیش نہیں کیا۔ علامہ نے جواب دیا" کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ متعین کر دی ہے"۔ پھر فرمایا" دنیا میں جلیل القدر انبیاء کے سوا اور کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی اصولی نظریہ قائم کیا ہو اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو"۔

ایک بار اور اسی قسم کے سوال کے جواب میں علامہ نے کہا تھا اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل کرتا تو شاعر نہ ہوتا بلکہ مہدی ہوتا"۔

خیر مہدی ہونے کا دعویٰ تو انہوں نے کیا اور نہ کوئی انہیں مہدی سمجھتا ہے اس کے باوجود ان کی زندگی کی بعض باتیں ضرور دل کو کھٹکتی ہیں۔ مثلاً پہلی بیوی سے یورپ سے واپس آنے کے فوراً بعد ناچاقی کا اور کسی صورت میں انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہ ہونا (اگرچہ تمام زندگی انہیں نان نفقہ دیتے رہے۔) اور ان پہلی بیوی سے اپنے بڑے لڑکے آفتاب اقبال سے قطعاً لاتعلق ہو جانا اور اس سے اس حد تک بیزار ہونا کہ اسے اپنے جنازے میں شریک ہونے کی بھی اجازت نہ دینا وغیرہ۔ ایسی باتیں ہیں جن کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا لیکن اصل وجوہات کیا تھیں ان کے پس منظر کے بارے میں بھی معلومات بہت ناکافی ہیں اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے یا نہیں۔ یہ ان کا انتہائی ذاتی معاملہ تھا جس سے ان کے عزیز خالد نظیر صوفی نے بھی اپنی کتاب" درون خانہ میں" پردہ نہیں اٹھایا۔ اسی طرح بعض داستانیں ان کی جوانی کی رنگ رلیوں کے بارے میں بھی مشہور ہیں جن میں کچھ تضاد بھی ہے۔ اس لیے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سچائی کتنی ہے اور فسانہ کتنا۔ بہرحال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال انسان تھے فرشتہ

نہیں تھے۔ خامیاں کس میں نہیں ہوتیں۔ نوجوانی میں لغزشیں کس سے سرزد نہیں ہوتیں لیکن جو اصل حقیقت مسلّمہ طور پر سب کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے آخری پچیس تیس سالوں میں گفتار کے غازی بھی تھے اور کردار کے بھی۔ نہایت درویشانہ زندگی تھی۔ سادگی، خودداری، تزکیہ نفس، قناعت اور توکل باللہ کی مثال۔

ذیل میں علامہ کی زندگی کے مختلف ادوار سے چند مستند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

پہلا واقعہ علامہ کے بچپن کا ہے جس زمانے میں علامہ اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے ایک ہم سبق تھے "خوشیا" ان سے علامہ کا بڑا یارانہ تھا۔ ساتھ ہی اسکول جاتے اور ساتھ ہی کھیلتے۔ تفریح کرتے۔ یہ چاچا خوشیا ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

بالے (اقبال) سے میری لڑائی زندگی میں صرف ایک بار ہوئی ہم دونوں نے دوسرے دوستوں سے چھپ کر امام صاحب کا میلہ دیکھنے کا پروگرام بنایا دو آنے بالے نے گھر سے لیے اور میں نے والدہ سے لڑجھگڑ کر اٹھنی حاصل کر لی۔ میلے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنی اٹھنی بھی بالے کو دے دی۔ کیونکہ وہ پیسوں کو بڑی احتیاط سے رکھتا تھا۔ میلے میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں نے اس سے کہا یار کچھ کھانا پینا چاہیے۔ بالے نے مسکرا کر جواب دیا۔ لیکن میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کیا مطلب؟ اس نے بڑے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ میں نے تمام پیسے اس اندھے فقیر کو دے دیئے جو زور زور کر میلہ دیکھنے والوں کو امداد کے لیے پکار رہا تھا۔" مجھے غصہ آگیا اور میں نے بڑے درشت لہجے میں کہا: اپنا پیٹ کاٹ کر دوسرے کی جھولی میں پیسہ ڈال دینا کہاں کی شرافت ہے۔ تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ تم میری اجازت لیے بغیر میری

اٹھنی اس اندھے کو دیتے تم نے میرے ساتھ بددیانتی کی ہے۔ بالے نے میرے فقرے سُنے اور کوئی بات کہے بغیر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ اس کے بعد پورے دو ماہ ہم ایک دوسرے سے نہیں بولے۔ دونوں کو اپنی اپنی بات کا پاس تھا۔ ایک روز شام کے وقت میں گھر پہنچا تو میری والدہ نے مجھے بتایا کہ بالا آیا تھا اور تمہارے لیے ایک اٹھنی دے گیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ میں اسی وقت مولوی میر حسن کے یہاں پہنچا۔ بالا مجھے دیکھتے ہی کمرے سے باہر آیا اور بڑے تپاک سے ملا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا۔ بالے نے مسکرا کر کہا: تمہاری اٹھنی تمہیں واپس مل گئی ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں"

دوسرا واقعہ بھاٹی دروازے میں قیام کے زمانے کا ہے ایم اے پاس کر کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کر رہے تھے چھبیس ستائیس سال کی عمر ہوگی۔ شباب تھا۔ مجلسی دلچسپیاں زوروں پر تھیں۔ ورزش اور کشتی سے شوق تھا۔ کبھی کبھی خود بھی اکھاڑے میں اُتر کے زور کرتے تھے۔ اس زمانے کی بات ہے کہ انہوں نے دو مہینے پوری باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھی بقول علی بخش جو اس واقعہ کا راوی ہے ان کا بیشتر وقت خوش الحانی سے تلاوت میں گزرتا تھا۔ کھانا پینا تقریباً چھوٹ گیا تھا۔ اکثر صرف دودھ پر گزارا کرتے تھے۔

تیسرا واقعہ ۱۹۱۴ء میں علامہ کی والدہ کی وفات موقع کا ہے۔ علامہ کو اپنی والدہ سے غیر معمولی محبت وارادت تھی ان کی وفات پر روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ عزیزوں تک کو اس راز کی خبر نہ تھی استفسار کرنے پر آپ نے احباب کو بتایا کہ جب میں چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ تھا تو میرے والد سیالکوٹ

کے مشہور رئیس ڈپٹی وزیر علی کے یہاں کپڑے سینے پر ملازم تھے ان ڈپٹی صاحب کے بارے میں میری والدہ کو یہ شبہ ہوا کہ ان کی آمدنی کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ دینی لحاظ سے مشکوک ہے چونکہ میرے والد ان کے ملازم تھے۔ اس لیے میری والدہ نے ان کی آمدنی کو بھی رزق حلال کے معیار کے منافی سمجھا اور مجھے اپنا دودھ پلانا بند کر دیا۔ محنت سے ایک بکری خریدی اور اس کا دودھ مجھے پلانے لگیں غرض یہ تھی کہ غیر رزق حلال کا دودھ میرا جزو بدن نہ بنے" مختصر یہ کہ تقویٰ علامہ کی گھٹی میں پڑا تھا۔

رزق حلال کے سلسلہ میں ان کی اپنی احتیاط کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو صاحبزادہ سید محمود الحسن نے بیان کیا ہے:

پٹنہ بہار کے قریب کی ایک جاگیر کا مقدمہ پٹنے کے مشہور وکیل سی آر داس کے پاس آیا۔ اس مقدمہ کی بعض دستاویزات فارسی میں تھیں جن کا خلاصہ انگریزی میں عدالت کے سامنے پیش ہونا تھا۔ اس کام کے لیے سی آر داس نے ڈاکٹر اقبال کی خدمات حاصل کیں۔ ڈاکٹر صاحب نے راتوں رات کام ختم کر کے کاغذات سی آر داس کو دے دیئے۔ وہ بہت حیران ہوئے کہنے لگے یہ آپ نے کیا کیا۔ یہ کام تو خاصا پیچیدہ اور دیر طلب تھا اس کا مشاہرہ بھی ایک ہزار روپیہ یومیہ تھا۔ آپ دو چار دن میں ختم کرتے تاکہ دو چار ہزار فیس بھی بنتی۔ علامہ نے سکون سے جواب دیا "مسٹر داس، میرے رسول نے فرمایا ہے مسلمان پر وہ اُجرت حرام ہے جو کام کو بے ضرورت لمبا کر کے لی جائے"۔

مال و دولت دنیا سے بے نیازی علامہ کی خصلت تھی۔ ان کے دیرینہ ملازم علی بخش کا بیان ہے:

علامہ ایک حد سے زیادہ وکالت کا کام اپنے ذمہ نہیں لیتے تھے وہ عام طور پر

پانچ سو روپیہ ماہانہ آمدنی کے مقدمات لیتے تھے اگر اور مقدمے آتے تو موکلوں سے کہتے کہ وہ اگلے ماہ آئیں۔ اگر مہینے کے ابتدائی تین چار دنوں میں انہیں چار پانچ سو روپے محنتانے کے مقدمے مل جاتے تو مہینے کے باقی دنوں میں کوئی اور مقدمہ نہ لیتے اگر مقدمہ جھوٹا ہوتا تو لینے سے صاف انکار کر دیتے اور کمزور ہوتا تو مؤکل کو سمجھا دیتے کہ تمہارے کیس میں جان نہیں ہے۔ خواہ مخواہ روپیہ ضائع مت کرو ایک دفعہ ایک شخص اپنے کیس کی وکالت کرانے کے لیے آیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مقدمہ بالکل بے جان ہے وہ آدمی بضد تھا کہ آپ اپنی منہ مانگی فیس لیں اور پیروی کریں اگر فیصلہ میرے خلاف بھی ہو گیا تو بھی مجھے افسوس نہ ہوگا۔ مگر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حرام کی کمائی کا قائل نہیں ہوں اور وہ شخص بگڑ کر چلا گیا۔

علامہ اقبال کچھ مدت کے لیے ریاست بہاولپور کے قانونی مشیر بھی رہے تھے ایک دفعہ ریاست کے کسی کام سے ان کو وائسرائے سے ملاقات کے لیے دلی جانا پڑا دوران ملاقات وائسرائے نے کہا: "کل شام کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں۔ علامہ نے فرمایا میں کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے تو آج شام ہی واپس جانا ہے۔ وائسرائے نے اصرار کیا تو علامہ نے کہا۔ اگر آپ کو دعوت کرنا ہی ہے تو آج شام ہی سہی۔ تاکہ میں وقت پر رات کی گاڑی سے روانہ ہو سکوں۔ چار و ناچار وائسرائے نے اس روز کے پہلے سے طے کیے گئے پروگرام ملتوی کیے اور عجلت سے علامہ کے اعزاز میں کھانے کا اہتمام کروایا۔ چنانچہ علامہ کھانے کے بعد وقت پر لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچنے پر علامہ کو ریاست کی طرف سے تار ملا کہ فوراً بہاولپور پہنچو۔ علامہ کو تار دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگے:

"انہوں نے مجھے اپنا نوکر سمجھ لیا ہے میں نہیں جاؤں گا"۔ چنانچہ علامہ نے ایک ہزار روپیہ

ماہانہ کی آمدنی پر لات ماردی اور استعفیٰ بھیج دیا۔

علامہ کی درویشی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے فکر و فن سے بھی فائدہ نہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے اپنے والد شیخ نور محمد کو خط میں لکھا "میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا یہ ایک خدا داد قوت ہے جس میں میری محنت کا کوئی دخل نہیں۔ اسے خلق اللہ کی خدمت میں صرف ہونا چاہیئے۔

یورپ سے آنے کے کچھ عرصے بعد اُنہوں نے گورنمنٹ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا۔ اچھی خاصی آمدن تھی اسے ٹھکرادیا۔ نوکری چھوڑ کر گھر آئے تو علی بخش سے کہا: "لو بھئی آج ہم آزاد ہو گئے۔ نوکری سے نجات مل گئی۔ علی بخش نے متفکر ہو کر سبب پوچھا تو کہا:

علی بخش انگریز کی نوکری میں بڑی پابندیاں ہیں میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں کھول کر کہنا چاہتا ہوں۔

۱۹۳۴ء کی علالت کے بعد سے وکالت کی آمدنی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ حد یہ کہ اپنا اور بیگم کا علاج کرانے کے لیے بھی تنگی تھی۔ اس صورتِ حال کا اندازہ کر کے علامہ کے دوست اور مداح سر راس مسعود نے نواب صاحب بھوپال حمید اللہ خان سے کہہ کر پانچ سو روپیہ کا وظیفہ مئی ۱۹۳۵ء میں جاری کرا دیا جو خود نواب صاحب نے نیاز مندانہ پیش کیا۔ اس کے بعد سر راس نے اتنی ہی رقم کے وظیفے کے لیے آغا خان سے سلسلہ جنبانی کی جب علامہ کو معلوم ہوا تو سر راس مسعود کو لکھا: "میں کسی امیرانہ زندگی کا قائل نہیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔"

غیرت مندی

سادگی اور قناعت سے لازمی طور پر غیرت مندی پیدا ہوتی ہے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں جب علامہ شدید علیل تھے اور روپے کی سخت ضرورت تھی سر اکبر حیدری نے حیدرآباد دکن کے توشہ خانے سے ایک ہزار روپیہ کا چیک بھیجا چونکہ پیش کش کا طریقہ مناسب نہ تھا علامہ کی غیرت نے اُسے قبول کرنا گوارا نہ کیا۔

اکل حلال

علامہ جائز و ناجائز کے بارے میں بے حد محتاط تھے وکیلوں کے پاس مؤکل عام طور پر تحفے تحائف لاتے ہیں جو محنتانہ کے علاوہ ہوتے ہیں۔ علامہ کو ان تحفوں کے قبول کرنے میں بھی تامل تھا۔ چنانچہ انہوں نے سید سلیمان ندوی سے وضاحت طلب کی کہ آیا ایسا مال مسلمان کیلئے حلال ہے۔

وکالت کے زمانے کی محدود آمدنی کے باوجود انکم ٹیکس باقاعدگی اور پوری راست بازی سے ادا کرتے تھے متعلقہ محکمہ میں علامہ کی فائل اب بھی محفوظ ہے۔

دیانت داری کی مثال

روزگارِ فقیر میں لکھا ہے کہ جب ان کے سیالکوٹ کے مکان کی بیع ہوئی ہے تو فریق ثانی نے شفعہ کے مقدمہ کے خوف سے معاہدہ سے زائد رقم درج کرنے کے لیے اصرار کیا اور شفعہ کا مقدمہ کامیاب بھی ہو گیا مگر علامہ کسی طرح اس نفع بخش فرضی اندراج پر آمادہ نہیں

ہوتے۔ انہوں نے اپنا نقصان گوارا کر لیا مگر غلط بیانی کو گوارا نہ کیا۔

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال ڈے منایا گیا اور تجویز کی گئی کہ اقبال کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی جائے۔ اس وقت اقبال نے جو بستر علالت پر نہیں بلکہ بستر مرگ پر تھے اس کو سن کر کہا: مجھے کسی تھیلی کی ضرورت نہیں اگر قوم فی الحقیقت میری قدر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ میری تعلیمات جاری رہیں تو اُسے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہئے

بڑے سخت ممتحن

بڑے سخت ممتحن تھے نمبر غیر معمولی احتیاط سے دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کمزور طالب علم کے نمبر بڑھانے کی سفارش کر بیٹھتا تو انہیں غصہ آجاتا اور ڈانٹ دیتے۔ برملا کہہ دیا کرتے تھے کہ نااہل اور نالائق نوجوان میری قوم میں سے نہیں ہیں۔

تزکیۂ نفس

۱۹۲۰ء میں اپنے والد کو لکھا:

روحانی کیفیات میں سب سے بڑا ممد و معاون کھانے پینے میں احتیاط ہے نبی کریمؐ کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے کے معاملہ میں اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔

اکابر صوفیا کی طرح علامہ نے بھی کبھی نفس کی خواہشات کو اپنے اُوپر غالب نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی ضبطِ نفس سے تزکیہ نفس کا اہتمام بھی کرتے۔ مثلاً آم آپ کو بے حد مرغوب تھے لیکن بازار سے جب کبھی آپ کے لیے آم منگوائے جاتے تو اپنی پسند کے آموں کی فرمائش

نہ کرتے۔ دوست احباب ملک کے دور دراز گوشوں سے آموں کی پیٹیاں بھیجتے۔ پیٹی کھلتی تو علی بخش سے کہتے سب سے اچھا آم چُن کر مجھے دو جب وہ بڑی محنت سے بہترین آم چھانٹ کر آپ کو دیتا تو آپ اُسے ایک نظر دیکھ کر واپس علی بخش کو دے دیتے اور کہتے یہ آم تم خُود کھالو۔ مرغوباتِ نفس کے خلاف یہ وہ طرز عمل ہے جو تزکیۂ نفس کے لیے صوفیاء کا شعار رہا ہے۔

صبر و شکر کی عادت

سخت بیماری کی حالت میں بھی اگر کوئی ان سے خیریت دریافت کرتا تو مسکرا کر فرماتے۔ "الحمدللہ اچھا ہُوں" دکھ اور غم کے احساس نے انہیں کبھی مغلوب نہیں کیا۔ ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔

خوفِ خُدا

گرمیوں کے دن تھے گردے کی شدید تکلیف تھی۔ فرش پر پانی ڈلوا کر لیٹے ہوئے تھے۔ غلام رسول مہر بیٹھے تھے ایک اور صاحب عیادت کے لیے آ گئے۔ علامہ نے مہر صاحب سے مخاطب ہوتے کہا۔ تکلیف انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے۔ مہر صاحب ابھی جواب بھی نہ دے پائے تھے کہ دوسرے صاحب بول اُٹھے۔ ڈاکٹر صاحب، دکھ سکھ سب اللہ ہی کی طرف سے آتا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ پہلے چیخ نکلی۔ پھر بلند آواز سے رونے لگے۔ ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو میری توبہ، میری توبہ میں نے کیوں شکوہ کیا۔ دیر کے بعد

طبیعت بحال ہوئی۔

حق گوئی و بے باکی

ایک دفعہ سر سکندر حیات خان پنجاب کے وزیر اعلیٰ عیادت کے لیے آئے ان کا بڑا شہرہ اور دبدبہ تھا۔ علامہ نے انہیں براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "سردار صاحب ہندوؤں اور سکھوں کو راضی کرنے کے لیے آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی سُبکی مول نہ لیں۔۔

ایک دفعہ وائسرائے ہند نے ریاستوں کے فرمانرواؤں اور ہندوستان کے اکابرین کو دعوت دی جس میں علامہ کے علاوہ مہاتما گاندھی بھی شریک ہوئے۔ جوں ہی گاندھی جی اندر آئے تو تمام حاضرین تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے لیکن علامہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ دعوت کے بعد وائسرائے نے علامہ کو الگ لے جا کر پُوچھا میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کریں گے۔ علامہ نے کہا کیا سوال ہے؟ اس پر وائسرائے نے کہا۔ تقریب میں مہاتما گاندھی کی تعظیم کے لیے سب لوگ کھڑے ہوتے یہاں تک کہ میں نے سر شفیع کو بھی اُٹھتے دیکھا مگر آپ اپنی جگہ بدستور بیٹھے رہے۔ علامہ نے جواب دیا:

"آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں کئی مسلمان ایسے ہیں جن کے باپ دادا ہندو تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے آباؤ اجداد کی صفات سے متصف ہیں۔ الحمد اللہ میں ان میں سے نہیں ہوں"۔

قلندری اور بے نیازی: آپ کا مسلک فقر تھا۔ نانِ شعیر ہی پر زندگی گزار دی۔ ایک

دفعہ ایک درویش آپ کے پاس آیا اور پوچھا دولت چاہتے ہو؟ جواب دیا "میں درویش ہوں دولت کی ہوس نہیں رکھتا"۔ پوچھا "عزت و جاہ چاہتے ہو"۔ جواب دیا "وہ بھی خدا نے کافی عطا کی ہے" پوچھا۔ "کیا خدا سے ملنے کی خواہش ہے؟" جواب دیا "سائیں یہ کیا کہہ رہے ہو میں بندہ۔ وہ خدا بندہ خدا سے کیسے مل سکتا ہے۔ قطرہ دریا میں مل جائے۔ تو قطرہ نہیں رہتا میں قطرہ کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں"۔ یہ سن کر اس درویش پر خاص قسم کی کیفیت طاری ہو گئی کہنے لگا بابا جیسے سنا تھا ویسا ہی پایا۔ تو تو خود آگاہ راز ہے۔ تجھے کسی دعا کی کیا ضرورت ہے"۔

ایک مرتبہ راجہ نریندر ناتھ نے علامہ کو چائے پر مدعو کیا فرش پر ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ علامہ ان سے بچ بچ کے گزر رہے تھے۔ راجہ صاحب نے حیرت کا اظہار کیا تو فرمایا میرے استاد محترم نے کہا تھا کہ ہرن کی کھال پر بیٹھنے یا چلنے سے انسان کے دل میں غرور کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور چونکہ حدیث میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے میں کھال پر چلنا پسند نہیں کرتا۔

کانگڑہ کے زلزلہ میں لاہور بھی ڈول رہا تھا۔ کواڑ کھڑکھڑا رہے تھے۔ علی بخش ڈر کے مارے کبھی کوٹھے پر جاتا تھا۔ کبھی صحن کی طرف بھاگتا۔ مکانوں کے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دہشت کا عالم تھا۔ لیکن علامہ چارپائی پر لیٹے ہوئے اطمینان سے کتاب پڑھتے رہے۔ علی بخش کی گھبراہٹ دیکھ کر کتاب سے سر اٹھایا اور کہا علی بخش یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو، سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ، یہ کہہ کر دوبارہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

نام نمود سے گریز: "روزگار فقیر" میں ہے کہ ایک بار یہ تجویز ہوا کہ اقبال

کے نام سے ایک فوجی سکول قائم کیا جائے۔ علامہ نے تجویز پیش کرنے والے فوجی افسر کو جواب دیا کہ ایک شاعر کے نام سے فوجی سکول کو منسوب و موسوم کرنا موزوں نہیں ہے اور پھر خود تجویز کیا کہ اس سکول کا نام ٹیپو فوجی اسکول رکھا جائے۔

غریب کا بیٹا

علامہ کی بھتیجی کی روایت ہے کہ جاوید اقبال کی پیدائش پر انہیں ددھیال اور ننھیال دونوں کی طرف سے سونے کی دو دو کنگن دیئے گئے تھے۔ ایک روز ان کی بھتیجی نے جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں کنگنوں کی ایک جوڑی جاوید کے ہاتھوں اور دوسری پاؤں میں پہنا دی اور سونے کی ایک زنجیر جس میں اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گلے میں ڈال دی۔ سونے کے ان زیورات میں چھ سات ماہ کا جاوید بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت علامہ بھی اندر آ گئے اور جاوید کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کی بھتیجی نے فخریہ انداز میں کہا "چچا جان دیکھئے جاوید! ان کنگنوں میں کتنا پیارا معلوم ہو رہا ہے" جواب میں انہوں نے کہا "سیما بیٹی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں یہ سارے زیورات اتار دو۔ جاوید کسی مہاجن کا لڑکا نہیں ایک غریب کا بیٹا ہے"۔

بیویوں سے سلوک

بیویوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ حد درجہ منصفانہ تھا۔ ایک دفعہ دونوں بیویوں کے لیے دو زیور بنوائے جب سنار نے انہیں تولا تو ان میں سے ایک دو ماشہ کم نکلا علامہ نے" دو ماشہ سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ ہی بیگم کو ادا کر دی۔

علی بخش کی روایت ہے کہ "جس وقت ان کی تینوں بیویاں اکٹھی ان کے پاس تھیں وہ سلوک میں ذرا بھی فرق گوارا نہ کرتے تھے۔ سب کے لیے ایک ہی وضع کا کپڑا، ایک ہی وضع کے جوتے اور ایک ہی وضع کا زیور بنواتے تھے جب کوئی چیز منگواتے تھے۔ توسب کے لیے منگواتے تھے"۔

جب بھوپال سے پانچسو روپے وظیفے کے لیے سر راس مسعود کا خط آیا تو خط پڑھتے ہی منشی طاہر الدین سے کہا: آفتاب کی ماں سے کہنا کہ وہ بھی آئندہ ہر مہینے پچاس روپے آکر لے جایا کرے۔ اس روایت کے راوی ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ ابھی آپ نے یہ جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ وہ خود آگئیں۔ چنانچہ منشی طاہر الدین صاحب نے علامہ کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔

بچوں کے ساتھ کھیلنا

جاوید اقبال لکھتے ہیں: بعض اوقات وہ ہمارے کھیل میں خود بھی شریک ہو جاتے۔ ہمارے ہاتھ ان کی طرف گیند پھینکتے پھینکتے تھک جاتے مگر وہ بلا تھامے ٹھپ ٹھپ کرتے رہتے۔ کئی بار موسم بہار میں جب میں کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا ہوتا تو وہ دبے پاؤں اوپر آجاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے۔ جب بھی کسی سے پیچ لڑاتے تو پتنگ کٹاتے۔

بچوں سے برتاؤ

علامہ کی بھتیجی سے روایت ہے کہ علامہ بچوں کی غلطیوں پر ان سے کبھی زیادہ

برہمی کا اظہار نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ اُنہیں احمق آدمی، بیوقوف، گدھا کہہ دیتے۔ اگر جاوید اور منیرہ آپس میں لڑ پڑتے تو بہت دُکھ کا اظہار کرتے۔ اگر جاوید کا رویہ سخت ہوتا تو کہتے "جاوید تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے سنگ دل ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں کون ہے"۔ جب جاوید کی والدہ فوت ہوئیں تو جاوید اور منیرہ دونوں رونے لگے۔ علامہ نے جاوید کو اپنے پاس بلا کر کہا تم مرد ہو۔ اور مرد کبھی رویا نہیں کرتے"۔

عید قربان پر جاوید کو تلقین کرتے کہ بکرے کو ذبح کرتے وقت موجود رہے لیکن اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جاوید اقبال نے ان پر اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک بار وہ بچپن میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوڑ رہے تھے، کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑے اور منہ سے خون نکلنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت علامہ اندر آگئے اور ان کا خون نکلتا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

جری سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت تھی۔ اکثر بچوں کو خالدؓ بن ولید اور فاروق اعظمؓ کے قصے سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے بالتحقیق یہ بتایا کہ واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا راستہ عرب ملاحوں نے بتایا تھا اور یہ کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے (ایک بار انہوں نے جاوید کو محض اس لیے فلم دیکھنے کی اجازت دے دی کہ وہ نپولین کی زندگی کے بارے میں تھی۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اصل میں وہ فلم نپولین کے معاشقوں کے بارے میں نکلی۔ لیکن ان کے اجازت دینے کا منشا کچھ اور تھا۔)

بچوں سے محبت

خالد نظیر صوفی راوی ہیں کہ بچوں کے ساتھ کھیلنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اپنے

بھتیجوں کو انہوں نے گود دن کھلایا اور ان پر طفل شیر خوار اور بچہ اور شمع، ایسی نظمیں لکھیں۔ اپنی بھتیجی سیمہ مبارک کو ایک طرح سے بیٹی بنا کر اپنے گھر ہی رکھ لیا تھا۔ انہیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر گھوڑا بنتے۔ ان سے ان کی سی باتیں کرتے اور خوش ہوتے۔ اپنے بچوں جاوید اور منیرہ سے کبھی سختی سے پیش نہیں آئے جاوید سے ناراض ہوتے تو اپنی برہمی کا سخت ترین اظہار، احمق، بے وقوف کہہ کر کرتے۔ ویسے جاوید سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ کہتے اس میں تو میری جان ہے۔ لیکن زیادہ کھل کر یا کسی کے سامنے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے کی معاشرتی قدریں ایسی تھیں کہ اولاد سے لاڈ کا اظہار معیوب سمجھا جاتا تھا۔

بچوں سے دلچسپی

چھوٹے بچوں سے ہنسنے کھیلنے اور انہیں چھیڑنے میں اقبال کو بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی عطا محمد کی بچیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی وسیمہ مبارک کو تو انہوں نے ایک طرح سے منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا۔ انہیں وسیمہ مبارک کے بیٹے خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب (اقبال درون خانہ) میں چند دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں اپنی مشہور زمانہ مثنوی اسرار خودی لکھنے کے زمانے ۱۹۱۴ء میں جب وہ اپنی دوسری بیوی سردار بیگم کے ساتھ سیالکوٹ آئے تو میری والدہ دو ڈھائی برس کی تھیں اور اپنے چچا (اقبال) کی بڑی چہیتی تھیں۔ وہ انہیں گود میں لیے کھلاتے رہتے۔ مٹھائی کا لالچ دے کر تمام گھر والوں کے عجیب عجیب نام پکارنے کو کہتے اور دوسروں کے بیچ بچپن ہونے سے بڑے محظوظ ہوتے۔ وہ بچپن کی ٹوٹی پھوٹی

اور توتلی باتیں بڑے شوق سے سُنتے۔ گھر کے تمام چھوٹے بچوں سے ان کے نام بار بار پوچھتے اور جب بچے اُلٹے سیدھے نام بتاتے تو خوب ہنستے۔

ان کی بڑی بھتیجی عنایت بیگم جب چھوٹی سی تھیں تو وہ جب ان سے ان کا نام پوچھتے تو وہ بڑی تیزی سے جواب دیتیں۔ علیت بیگن آپ خوب ہنستے اور فرماتے۔ عنایت نام نہیں بتاتی بلکہ بندوق داغتی ہے۔ اس کے بعد ان کی چھوٹی بھتیجی کی باری آئی تو وہ آہستہ سے اپنا نام "چھیما بارک" (وسیمہ مبارک) بتاتیں تو آپ پوچھتے کون سے بارک تو جیوں والی؟ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ محلے میں کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تجمل حسین رکھا گیا ان کی چھوٹی بھتیجی (وسیمہ مبارک) اپنی توتلی زبان میں اسے "جمل شین" کہتیں۔ انہیں یہ جمل شین ایسا پسند آیا کہ بار بار پوچھتے اور وہ بار بار بھولپن سے جمل شین بتا دیتیں تو وہ خوب ہنستے۔ آخر بار بار پوچھنے سے زچ ہو کر غصہ سے بولیں "شو واری تے دشیا اے۔ جمل شین۔ جمل شین، جمل شین" آپ بچی کی معصوم برہمی سے بہت محظوظ ہوئے اور ہنستے ہوئے فرمایا۔ اچھا بابا۔ ہماری توبہ اب کبھی نہ پوچھیں گے۔"

گھریلو محفلوں میں وہ بڑے شوق سے شریک ہوتے جب بھی لاہور سے سیالکوٹ جاتے تو اقبال منزل کی اندرونی بیٹھک میں تختوں کے اُوپر گھریلو محفل جمتی۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے اور آہستہ آہستہ حقے کے کش لگاتے ہوئے اپنی بڑی بھابی اور چھوٹی بہنوں سے خاندان اور محلے کی باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سنتے۔ گھریلو باتیں سُنتے ہوئے کبھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ خود بھی ہر ایک کے متعلق پوچھتے۔ اگر کبھی دونوں چھوٹی بہنیں (کریم بی بی اور زینت بی بی) کسی اختلافی موضوع پر آپس میں جھگڑتیں تو

ہلکا ہلکا مسکراتے رہتے اور ان کی نوک جھونک مزے سے سنتے رہتے۔ اگر محلے میں سے کوئی بچپن کا ساتھی ملنے کے لیے آ جاتا تو بڑے تپاک سے ملتے اور بچپن کی باتیں یاد کر کے بہت خوش ہوتے۔

ملازموں سے سلوک

علی بخش تقریباً چالیس سال تک علامہ کی خدمت کرتا رہا لیکن علامہ نے نہ تو اسے کبھی ڈانٹا اور نہ بُرا بھلا کہا۔ ذکر اقبال میں یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے "ایک دفعہ علی بخش چھٹی پر گیا اور اپنی جگہ رحمے کو رکھوا گیا جب واپس آیا تو رحمے نے پریشانی ظاہر کی کہ اب میں کہاں جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا چلو تم بھی رہو۔ اس کے بعد کہیں رحما چھٹی پر گیا تو اپنی جگہ ایک اور شخص کو رکھوا گیا جب واپس آیا تو یہ تیسرا نوکر پریشان ہوا علامہ نے اس کو بھی رکھ لیا۔ کام بمشکل ایک کا تھا۔ لیکن تینوں نوکر آخر تک رہے"۔

گھر والوں اور گھر ملازموں سے سلوک

اقبال کے نواسے صاحب نے اپنی والدہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ گھر والوں اور گھریلو ملازموں سے علامہ کا برتاؤ انتہائی شفقت آمیز ہوتا تھا۔ کبھی کسی کو سخت سست نہیں کہا۔ اگر کسی سے کوئی کوتاہی ہو جاتی تو در گزر فرماتے۔ بڑی سے بڑی بات پر بھی غصہ نہ آتا اور اگر کبھی آتا بھی تو تھوڑی دیر کے لیے۔ تحمل ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ وہی خاتون راوی ہیں کہ ایک روز ابھی کھانا پکنا شروع ہی ہوا تھا کہ وہ خلاف معمول باورچی خانے میں آ گئے اور کہا آج مجھے ذرا جلدی کچہری پہنچنا ہے۔ اس لیے کھانا

جلد تیار کر دیں۔ ان کی بیگم نے گھبرا کر محض ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ بس ابھی تیار ہوا چاہتا ہے
یہ سن کر وہ باورچی خانے کے سامنے پڑی چار پائی پر بیٹھ گئے اور فرمایا اچھا میں یہیں
بیٹھ کر انتظار کرتا ہوں۔ اب تو ان کی بیگم (سردار بیگم) اور بھتیجی کے ہاتھ پاؤں
پھول گئے۔ کھانا اتنی جلدی تیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ خاصی دیر کے بعد انہوں نے
پھر کھانے کے متعلق پوچھا۔ ان کی بیگم نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے کہا بس جی ابھی
تیار ہوا جاتا ہے وہ پھر سر جھکا کر سوچ میں ڈوب گئے۔ اسی طرح تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ
گھنٹہ گزر گیا۔ تب کہیں جا کر انہیں کھانا ملا۔ لیکن انہوں نے کسی قسم کی برہمی یا تنگ
مزاجی کا اظہار نہیں کیا خاموشی سے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ ملازمین سے خواہ کتنا بڑا
نقصان ہو جاتا وہ ہمیشہ معاف کر دیتے ان کی بھتیجی سے روایت ہے کہ انہیں ملازموں
کے کھانے وغیرہ کا بھی خاص طور پر خیال رہتا تھا۔ جو چیز گھر میں تیار ہوتی یا باہر سے آتی۔
تمام ملازموں کو ضرور دی جاتی کبھی یہ نہیں ہوا کہ انہوں نے کوئی چیز اکیلے کھائی ہو۔

انہی خاتون سے روایت ہے کہ ایک دفعہ گھر میں پلی گائے کے بچھڑے کو
باؤلے کتے نے کاٹ لیا جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو گیا۔ زہر کا اثر زائل کرنے کے
لیے اُسے روزانہ دوا دی جاتی۔ ایک روز ایک ملازم اُسے دوا دے رہا تھا کہ
بچھڑے نے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ ان کو معلوم ہوا تو اسی وقت ملازم کو کسولی
پہاڑ پر علاج کے لیے بھجوا دیا۔ ان دنوں باؤلے کتے کے کاٹے کا علاج صرف
کسولی کے ہسپتال میں ہوتا تھا۔ وہ ملازم مکمل طور پر صحت یاب ہونے تک وہاں
زیر علاج رہا اور اس دوران میں اس کے تمام اخراجات انہوں نے خود برداشت
کیے۔

پُرانے خدمت گار علی بخش کا بیان

علی بخش تقریباً چالیس برس علامہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی مجھے بُرا بھلا نہیں کہا۔ ایک دفعہ ان کے بھانجے نے مجھے گالی دی تو اس پر سخت ناراض ہوئے۔ بلکہ مارا بھی البتہ دو تین دفعہ مجھ پر خفا ضرور ہوئے لیکن یہ خفگی بھی زیادہ دیر نہیں رہی۔ وفات سے سال بھر پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ایک سکھ آیا۔ (ان کے ہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے کوئی روک ٹوک نہ تھی) اس نے آتے ہی گلاس مانگا۔ اور بغل سے بوتل نکالی۔ گلاس میں شراب انڈیل غٹا غٹ چڑھا گیا۔ علامہ صاحب کو تاب کہاں سخت خفا ہوئے اور فرمانے لگے "تم نے اس کمبخت کو گلاس کیوں لا کر دیا اور جب وہ شراب پینے لگا تو اسے روکا کیوں نہیں"۔ اس واقعہ کے سوا وہ عمر بھر کبھی مجھ سے اس قدر ناراض نہیں ہوئے۔

روایاتِ اقبال میں علی بخش ہی سے روایت ہے کہ وہ جو خود کھاتے تھے وہی نوکروں کو بھی کھلاتے تھے۔ نوکروں کے لیے کبھی الگ کھانا نہیں پکتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہمارے لیے اندر سے دال آئی جس میں گھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب اتفاق سے یہ بات معلوم ہو گئی گھر میں پہنچے تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ دال تم نے نوکروں کو نہیں کھلائی مجھے کھلائی۔ میں ایسی بات کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نوکر ہمارے دست و بازو ہیں۔ ہم ان کے پروں پر اڑتے ہیں۔ ہمارے سب کام اُن کے سہارے چلتے ہیں۔ یہ بات بہت بُری ہے کہ کھانے میں ان کو الگ رکھا جائے۔

جانوروں کے ساتھ رحم دلی خالد نظیر صوفی نے اقبال کی اہلیہ (سردار بیگم) کے

حوالے سے لکھا ہے۔

انسان تو انسان، بے زبان جانوروں کی مظلومی اور تکلیف پر بھی وہ تڑپ اُٹھتے تھے۔ جن دنوں وہ انارکلی میں رہتے تھے تو انہوں نے (سردار بیگم نے) چوزے نکلوائے سارا دن مرغی اپنے بچوں کو اِدھر اُدھر لیے پھرتی ساتھ والے مکان میں ایک ہندو رہتے تھے۔ دونوں مکانوں کا صحن مشترکہ تھا۔ اگر کسی وقت مرغی اور چوزے چگتے چگتے ہندو ہمسائے کی طرف چلے جاتے تو وہ لوگ بُرا مناتے ایک روز کا ذکر ہے کہ علامہ بالاخانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے نیچے صحن میں چوزے اپنی ماں کے ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے کہ ہندو ہمسائے کے ملازم نے لپک کر ایک چوزہ پکڑ لیا اور اُس کی دونوں ٹانگیں مروڑ کر نالے میں پھینک دیا۔ علامہ یہ ظلم دیکھ کر غصے سے گرجے تو وہ بھاگ گیا۔ انہوں نے علی بخش سے کہا کہ نیچے جا کر دیکھو اس ظالم نے اس بے زبان کی ٹانگیں توڑ دی ہیں علی بخش جا کر چوزہ اُٹھا لایا وہ مر چکا تھا۔ وہ غصے سے سُرخ ہو گئے۔ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑ لیا اور علی بخش کو حکم دیا کہ اسی وقت اس ظالم کو پکڑ کر لاؤ میں بھی اس کی ٹانگیں توڑ کر اس کو بتاؤں گا کہ بے زبان بھی تکلیف کا احساس رکھتے ہیں۔ بڑی مشکل سے ان کی اہلیہ نے اُن کا غصہ ٹھنڈا کیا پھر بھی وہ منتظر رہے کہ وہ نابکار ملازم ہاتھ آجائے تو اس کی خبر لیں۔ وہ ڈر کر وہاں سے ملازمت ہی چھوڑ گیا۔

والدین سے عقیدت و محبت

علامہ کے والد شیخ نور محمد رسمی تعلیم کے اعتبار سے کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن دین کا صحیح ذوق اور تصوف سے شغف رکھتے تھے۔ علامہ نے ایک بار خود بیان کیا کہ

ہمارے یہاں ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کا باقاعدہ درس ہوتا تھا۔ ایک عالم آتے تھے اور فلسفۂ تصوف کی اس کتاب کی تفسیر کرتے تھے۔ یہ شیخ صاحب کو خود بھی فلسفہ اور تصوف کے مسائل میں اتنا درک تھا کہ مولوی میر حسن نے انہیں ان پڑھ فلسفی کا لقب دے رکھا تھا۔ شیخ صاحب کو اہل اللہ اور صوفیاء کرام سے بھی دلچسپی تھی۔ خود قادریہ سلسلہ میں بیعت تھے علامہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے والد سے بھی بیعت تھے۔ ان کی وفات کے بعد علامہ نے قبر کے لیے جو کتبہ تیار کرایا اس میں انہیں پدر و مرشد اقبال ہی لکھوایا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں مجازی طور پر مرشد کہا ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ انہیں ان سے گہری عقیدت تھی ان کے کشف و کرامت کے واقعات انہوں نے ۱۹۰۷ء میں لندن میں عطیہ فیضی سے بیان کیے اور بعد کو دوسرے دوستوں کو بھی سناتے۔ ان کی والدہ زہد و تقویٰ میں شیخ صاحب سے بھی بڑھی ہوئی تھیں۔ اس سلسلہ میں میاں محمد شفیع صاحب نے اقبال کے حوالے سے ایک اہم واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

اپنی والدہ کی وفات پر علامہ نے کہا تھا کہ میں آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ میں آپ کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکوں گا سب کو حتیٰ کہ قریبی عزیزوں کو بھی تجسس تھا کہ وہ کونسا ایسا احسان تھا۔ اس راز سے ایک بار خود علامہ نے پردہ اٹھایا۔ فرمایا کہ جب میں دودھ پیتا بچہ تھا تو میری ماں کو شک گزرا کہ میرے والد کی آمدنی مشکوک ہے۔ شیخ صاحب جس ڈپٹی صاحب کے یہاں سلائی کرنے پر ملازم تھے ان کی آمدنی کے ایک جز پر شک تھا۔ گویا مشکوک ذریعہ آمدنی سے تنخواہ لینا بھی ان کے نزدیک رزقِ حلال کے منافی تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان پیسوں سے جو رزقِ حلال سے بچا کر رکھے تھے ایک بکری خریدی اور مجھے اس کا دودھ پلانا

شروع کیا اور اپنا دودھ بند کر دیا۔ کہ مشکوک آمدنی کے رزق سے پیدا ہونے والا دودھ میرے جسم میں نہ جائے اور جب تک میرے والد نے انہیں یقین نہیں دلایا کہ ان کی آمدنی حلال ہے اور مشکوک ذریعہ آمدنی کو چھوڑ نہیں دیا۔ انہوں نے اپنا دُودھ مجھے نہیں پلایا علامہ کہتے تھے کہ میری ماں کا رزقِ حلال کے سلسلہ میں یہ مجھ پر بڑا احسان ہے۔

اپنی والدہ سے علامہ کو جو غیر معمولی عقیدت تھی اس کا اظہار اس مرثیے سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۹۱۴ء میں ان کی وفات کے بعد لکھا۔

اقبال درون خانہ، کے مصنف خالد نذیر صوفی لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی والدہ کی دیانت داری عملی دیانت داری تھی۔ وہ سراپا شفقت و رحمت تھیں۔ محلے پڑوس کی نادار بچیوں کی پرورش و پرداخت کرنا اور ان کے شادی بیاہ کا انتظام بھی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ گھر کے سامنے ایک اجنبی سبزی فروش خوانچہ ڈالے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی بیٹی کو بھی پال پوس کر بڑا کیا اور اپنے گھر سے عزت سے بیاہ کر رخصت کیا۔

ان درویش صفت والدین نے اپنی روشن ضمیری سے اقبال کے دل کو بھی روشن کیا۔ ان کے اندر بھی دین کا صحیح ذوق پیدا کیا۔

مثنوی رموزِ بیخودی میں علامہ نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک سائل بھیک مانگتا ہوا اور صدا لگاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا۔ بڑا اڑیل تھا کہ دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اور چیخ چیخ کر صدا لگانے سے باز نہیں آتا تھا۔ بچپن تھا طیش آگیا فقیر کو مارا۔ مارپیٹ میں اس کی جھولی میں جو کچھ تھا زمین پر گر پڑا۔ علامہ کے والد یہ دیکھ کر بہت آزردہ ہوئے اور افسردہ

ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن خیر الرسلؐ کی اُمت سرکار کے حضور جمع ہوگی تو یہ گدا تیرے درد مند تمہارے اس برتاؤ کے خلاف رسول کریمؐ سے فریاد کرے گا۔ تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر رسول کریمؐ نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے مسلمان بچہ عطا کیا تھا تو اسے بھی انسان نہ بنا سکا۔ اس ملامت سے مجھے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔

شیخ نور محمد کا قاعدہ تھا کہ جب بھی اپنے ہونہار بچے کو ٹوکتے یا نصیحت کرتے تو اکثر و بیشتر قرآن کریم یا اسوہ رسول کریمؐ کے حوالے سے بات کرتے۔ گویا قرآن حکیم اور اسوہ رسول اللہ کا احترام ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔

حج اصغر

ایک دفعہ کسی نے علامہ سے دریافت کیا کہ آپ ابھی تک حج پر نہیں گئے۔ علامہ نے اطمینان سے فرمایا میں تو ہر سال حج پر جاتا ہوں۔ پوچھنے والا بڑا حیران ہوا۔ اور کہا ہم نے تو کبھی نہیں سُنا کہ آپ حج پر گئے ہوں۔ اس پر علامہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ جاتا ہوں اور وہاں اپنے والدین کی خدمت میں حاضری دیتا ہوں۔ یہی میرا حج ہے۔ سبحان اللہ۔ والدین سے عقیدت و ارادت کا یہ عالم تھا کہ ان کی خدمت میں حاضری کو حج اصغر سمجھتے تھے۔

عشقِ رسول کریمؐ

رسول اللہ سے محبت تو ہر مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا جب تک مسلمان ہر چیز سے زیادہ، ہر شے سے زیادہ، اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت

نہ کرے۔ لیکن یہ ایک آئنڈیل ہے۔ ہر کوئی ایمان کی اس منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ یہ اقبال کی بات دوسری تھی وہ اکابر اولیا اور صوفیا۔ کی طرح عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رسول اللہؐ سے شدید محبت، ان کے لیے قال نہیں، حال تھی اور اس کا اظہار بے ساختگی سے ہوتا رہتا تھا۔ میر تقی میر نے اپنے محبوب کے بارے میں کہا تھا۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

اقبال اس منزل سے بھی آگے تھے۔ جب کبھی رسول کریمؐ کا نام نامی آتا ان پر رقت طاری ہو جاتی۔ ان کا عشق بہت گہرا اور سچا تھا۔ وہ عقلی بھی تھا اور جذباتی بھی فرمایا کرتے تھے کہ رسالت کے اسرار و رموز کو ابھی زمانہ سمجھا ہی نہیں ہے۔ پھر کہتے۔ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔

رسول کریمؐ سے گہری وابستگی کچھ تو انہیں اپنے درویش صفت الدین سے ورثے میں ملی تھی اور کچھ انہوں نے خود حاصل کی تھی۔ ذیل کے چند واقعات و ملفوظات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے عشق رسولؐ کی نوعیت کیا تھی اور کس طرح یہ جذبہ ان کے فکر و احساس پر چھایا ہوا تھا۔

ایک محفل میں کسی نے علامہ سے کہا: آپ عالم بھی ہیں اور فلسفی بھی کیا آپ خُدا کا وجُود فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں؟ علامہ نے جواب دیا "نہیں"، تو سائل نے پُوچھا تو آپ نے خُدا کے وجود کو کیوں کر تسلیم کیا؟ علامہ نے فرمایا۔ یقیناً خُدا کی ہستی ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجُود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبرؐ نے جن کے متعلق دشمن بھی کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی جھُوٹ نہیں بولا جب فرمایا ہے کہ

خُدا مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے تو خُدا کی ہستی یقیناً موجُود ہے۔

درود کا ورد

علامہ کو جب بھی فراغت ملتی تھی تو وہ رسول کریمؐ پر درود بھیجتے تھے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے گِن کر ایک کروڑ مرتبہ درود شریف کا ورد کیا ہے۔

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق
لب پہ صلوٰۃ و درود، دل میں صلوٰۃ و سلام

جب دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو علامہ کے گہرے دوست فقیر نجم الدین نے کہا "تم مصر فلسطین گئے کیا اچھا ہوتا کہ ساتھ ہی روضہ اطہر کی زیارت بھی کر لیتے۔ یہ سنتے ہی علامہ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ چہرہ زرد ہوگیا اور آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے یہ کیفیت رہی۔ پھر بولے "فقیر، میں کس منہ سے روضہ اطہر جاتا"۔

جاوید اقبال لکھتے ہیں:

میں نے اماں جان کی موت پر بھی انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا۔ مگر قرآن مجید سنتے وقت یا کوئی شعر پڑھتے وقت، یا رسول اللہؐ کا اسم مبارک نوک زبان پر آتے ہی ان کی انکھیں بھر آیا کرتی تھیں۔

اگر علامہ کے سامنے کوئی مُسلمان، غیر مسلموں کی تقلید میں محمد صاحب کہتا تو آپ کو بہت دکھ ہوتا۔ زندگی کے آخری ایام میں کچھ لوگ آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائے تو دیکھا طبیعت دگرگوں ہے۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ وجہ پوچھی تو فرمایا:

"آج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ آنحضرت کو بار بار محمد صاحب

کہنا تھا۔ مجھے سخت افسوس ہوا جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔"

ایک بار کسی نے آپ کی مجلس میں رسول کریم کی شان میں گستاخانہ کلمات منہ سے نکالے آپ سخت برہم ہوتے اور اُسے کھڑے کھڑے محفل سے نکال دیا۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا میں تو یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص میرے پاس آکر کہے تمہارے پیغمبر نے میلے کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ رسول مقبولؐ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ سے کسی نے پوچھا۔ خدا کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا۔

یہ بات ہمیں رسول اکرم نے بتائی ہے جنھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا

علامہ کو مسدس کا یہ بند" وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" بہت پسند تھا اس کو سنتے ہی دل بھر آتا اور بے اختیار رونے لگتے آپ کا خیال تھا کہ رسولؐ کی سیرت ہی مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرسکتی ہے ان کے نزدیک عشق رسولؐ کا صحیح مفہوم اتباع رسولؐ تھا۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا آنحضرتؐ کا دیدار کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ نے فرمایا پہلے ان کے اسوہ حسنہ پر عمل کرو اور اپنی زندگی کو اس میں ڈھالو اور پھر خود اپنے آپ کو دیکھو۔ یہی ان کا دیدار ہے"

ایک بار علامہ نے پنجاب کے ایک رئیس کے ہاں ایک مقدمے کے سلسلہ میں قیام کیا تو رات کو اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے آج ہمیں یہ رتبہ نصیب ہوا اس نے ساری ساری زندگی بوریئے پر گزار دی اس خیال کا آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی اور برابر کے غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا جب ذرا قرار آیا تو علی بخش کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوا دی

اور جب تک وہاں رہے اسی غسل خانے میں سوتے رہے۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہ طٰہٰ!

ایک بار کسی تقریب میں ایف سی کالج لاہور کے پرنسپل نے علامہ سے پوچھا آپ کے نزدیک آپ کے نبی پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا۔ یا الفاظ نازل ہوتے تھے۔" آپ نے جواب دیا۔ میرے نزدیک تو قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرتؐ پر نازل ہوتی تھی۔ پرنسپل نے ایک جدید تعلیم یافتہ اور فلسفہ کے ڈاکٹر سے اس طرح کے عقیدے پر تعجب کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا:

مجھے تو خود اس کا تجربہ ہے میں پیغمبر نہیں ہوں، محض شاعر ہوں جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو میرے دل میں بنے بنائے ڈھلے ڈھلائے شعر نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ آنحضرتؐ پر قرآن مجید کی پوری عبارت لفظ بہ لفظ نازل ہوتی تھی۔"

احترام رسولؐ کا ایک واقعہ علامہ کے ایک ملاقاتی حکیم احمد شجاع سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جب وہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ کو غیر معمولی طور پر متفکر و پریشان پایا وجہ دریافت کرنے پر علامہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ حکیم۔ میں یہ سوچ کر اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہؐ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔

اسوہ رسول کریمؐ کی حکمتوں اور گہرائیوں پر ان کی بڑی نظر تھی اور یہی وہ مقام تھا۔ جہاں وہ عشق رسولؐ میں روایتی صوفیوں سے علیحدہ نظر آتے ہیں۔

ایک بار علامہ کے سامنے کسی نے ذکر چھیڑ دیا کہ مسجد نبوی کے اندر بلی نے بچے دیے۔ ایک صحابی نے کسی قدر ناراضگی سے انہیں باہر پھینکنے کی کوشش کی آنحضرتؐ کی نظر پڑ گئی تو سخت کبیدہ خاطر ہوئے۔

یہ واقعہ سنتے ہی علامہ پر رقت طاری ہو گئی۔ فرمایا:

رسول کریم کے اسوۂ حسنہ میں سب سے زیادہ اہمیت مادرانہ شفقت کو دی گئی ہے کہ یہی بنی نوع انسان کی بقا کا مقدس ذریعہ ہے۔

جاوید اقبال عزیز لکھتے ہیں:

گھر میں نہ تو ریڈیو تھا اور نہ گراموفون بجانے کی اجازت تھی کیونکہ ابا جان ایسی چیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ گانا سننے کا انہیں شوق ضرور تھا اور اچھا گانے والوں کو جب کبھی گھر بلوا کر ان سے اپنا یا اوروں کا کلام سنتے تو مجھے پاس بٹھا لیتے۔ ستار سنا کرتے تھے۔ خود جوانی میں ستار کا شوق رہ چکا تھا۔

صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت پر ہی نیت باندھ لیتے۔ دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پہ تولیہ رکھ لیتے۔

ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی دیواریں گرد و غبار سے اٹی ہوتیں بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت آہیں بھرا کرتے وہ فطرتاً سست تھے اس لیے اگر کہیں زنت کی پابندی ہوتی تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جاتی۔ چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے خوش رہتے۔ کئی بار دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کی وجہ سے بھول جایا کرتے اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی

تو علی بخش کو بلوا کر معصومانہ انداز سے پوچھتے کیوں بھئی میں نے کھانا کھالیا ہے" شام کو گھر کے دالان ہی میں دو ایک چکر لگالیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں بظاہر کامل جمود تھا۔

شعائرِ اسلام سے دلچسپی

روزہ، نماز اور شعائر اسلام تو گویا اقبال کی گھٹی میں پڑے تھے۔ ہو سکتا ہے زندگی کے ہر دور میں ان کی سختی سے پابند نہ رہے ہوں لیکن ان کے تقریباً چالیس سال تک کے خدمت گزار علی بخش کی شہادت یہ ہے :

کہ صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت سے ان کا معمول تھا۔ قرآن بلند آواز سے بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ آخری بیماری کے زمانے میں گلا بالکل بیٹھ جانے کی وجہ سے تلاوت نہیں کر سکتے تھے۔ نماز بھی چھوٹ گئی تھی پھر بھی انتقال سے کچھ عرصے پہلے بڑے شوق سے نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ علی بخش نے وضو کرایا بڑے اہتمام سے بستر پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھی کبھی کبھی تہجد بھی پڑھا کرتے تھے۔ علی بخش کا بیان ہے کہ یورپ سے جانے قبل بھاٹی دروازے کے قیام کے دوران پورے دو مہینے باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھی۔ دن کے خاصے وقت خوش الحانی سے قرآن خوانی کرتے رہتے اس عرصے میں کھانا پینا چھوٹ سا گیا تھا۔ تھوڑا سا دودھ پی کر گزارہ کرتے تھے۔

علامہ کے بیٹے جاوید اقبال نے اپنے مضمون "اقبال ایک باپ کی حیثیت سے" میں لکھا ہے کہ وہ روزے کبھی کبھار رکھتے تھے اور جب رکھتے تھے تو دوپہر ہی سے بھوک سے بے چین ہو کر بار بار علی بخش سے پوچھتے کہ افطار میں کتنی دیر باقی ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں جب علامہ کا انتقال ہوا ہے تو جاوید اقبال صاحب کی عمر پورے تیرہ سال بھی نہیں

تھی۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے علامہ کی جان لیوا بیماری شروع ہو چکی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جاوید اقبال کی یادیں اس زمانے کی ہیں جب اقبال مختلف عوارض کا شکار ہو چکے تھے لیکن ان کی قرآن خوانی کی عادت اور قرآن سننے کے ذوق وشوق کے بارے میں علی بخش جاوید اقبال اور بچوں کی جرمن اتالیق ڈورالیپٹ سب یک زبان ہیں۔ جاوید اقبال نے خاص طور پر ایک عربی قاری کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ آتے تو دونوں بچوں کو بھی اُن کی قرأت سننے کے لیے بلایا جاتا۔ ایک دفعہ جب عرب، قاری صاحب نے سورۂ مزمل سنائی تو علامہ زار وقطار روتے۔

مسجد شہید گنج

جب مسجد شہید گنج کی اپیل خارج ہوئی تو مسلمانوں میں سخت ہیجان برپا تھا پورے شہر میں جابجا احتجاجی جلوس نکلنا شروع ہو گئے۔ شام کو ایک صاحب غلام رسول خان نامی علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں اب کیا کرنا چاہیے۔" علامہ رو پڑے اور فرمایا:

مجھ سے کیا پوچھتے ہو، میری چارپائی اپنے کندھوں پر اٹھاؤ اور اس طرف لے چلو جدھر مسلمان جا رہے ہیں اگر گولی چلی تو میں بھی ان کے ساتھ مروں گا۔

اسلامی معاشرہ اور طلبا

علامہ اسلامی معاشرہ کے قیام کے بڑے حامی اور مبلغ تھے خصوصیت سے جب طلبا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہیں اسلامی روایات زندہ کرنے اور شعائر

اسلامی کو ترویج دینے کے بڑے دلنشین انداز میں تلقین فرماتے۔ کوٹھی کے قریب ہی
ایک مسجد تھی جب اذان کی آواز آتی تو علامہ ایک دم مودّب ہو کر خاموش ہو جاتے
اور خواہ کتنی اہم بحث ہو اس کا سلسلہ قطع کر دیتے۔

پردہ کا اہتمام

علامہ پردے کے سخت حامی تھے اور عورتوں کا محفلوں میں مردوں سے ملنا جلنا
پسند نہیں کرتے تھے اور اس میں دوست احباب کی رعایت بھی نہیں کرتے تھے۔ لاہور
کے مشہور رئیس میاں نظام الدین سے ان کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ ان کے لڑکے (ناول
نگار) میاں اسلم لکھتے ہیں۔

ایک روز ہمارے یہاں کوئی تقریب تھی۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا جاؤ ڈاکٹر صاحب
سے عرض کرو کہ اگر آپ کی بیگم صاحبہ بھی تقریب میں شریک ہوں گی تو یہ ہماری عزت
افزائی ہو گی۔ میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور والد صاحب کا پیغام دیا۔ یہ سُن کر
علامہ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ میاں صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں۔
اور کہیں کہ میں عورتوں کا محفلوں میں مردوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔

ستمبر ۱۹۳۳ء میں اقبال کو والیٔ افغانستان نے سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی
کے ساتھ افغانستان آنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر لیڈی مسعود نے بھی افغانستان جانے
کی خواہش کا اظہار کیا اس زمانے میں سر راس کے ساتھ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سر
راس مسعود نے اقبال سے مشورہ کیا۔ سر راس سے اقبال کے بہت قوی تعلقات تھے
لیکن اقبال نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے صاف منع کر دیا کہ ایسے تعلیمی اور دینی مشن

کے ساتھ ایک بے پردہ خاتون کا جانا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ لیڈی مسعود کو بھی ماننے ہی بنی۔

مولانا مودودی سے روایت ہے :

ایک مرتبہ حکومت ہند نے علامہ کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور ایک اونچا سفارتی عہدہ پیش کیا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ لیڈی اقبال کو پردہ نہ کرائیں گے۔ اور سرکاری تقاریب میں ان کو بھی ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ علامہ نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور خود وائسرائے لارڈ ولنگڈن سے کہا بے شک میں ایک گنہگار آدمی ہوں احکام اسلامی کی تعمیل میں مجھ سے بھی کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں مگر میں اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کا حکم توڑ دوں۔

اقبال بقول اقبال

اپنے اشعار میں، اپنے خطوط میں، اکثر اپنی گفتگو میں بھی، اقبال نے اپنے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہ تبصرہ سیدھا سادا، اُصاف، کھرا اور بے لاگ لپیٹ کے کیا گیا ہے نہ اس میں ریاکارانہ انکسار ہے اور نہ اس سے فخر و مباہات کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔

عطیہ فیضی سے ان کے مخلصانہ مراسم تھے ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیتہً ہمنوا ہیں"

اقبال کی بھتیجی کے بیٹے خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب اقبال درون خانہ میں اپنی والدہ

اور بیگم اقبال کے حوالے سے لکھا ہے ایک دفعہ علامہ اپنے سفرِ حیدر آباد کے واقعات بیان کر رہے تھے ہم دونوں دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھیں انہوں نے بتایا ایک روز حیدر آباد کے وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد کے ہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوا جام چھلکنے لگے۔ علامہ اتنی ہی بات کہہ پائے تھے کہ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا کیا آپ نے بھی شوق فرمایا؟ انہوں نے جواب دیا نہیں بھائی میں محفل سے اُٹھ گیا تھا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔"

ایک دفعہ گردوں میں درد پیدا ہوئی تو ڈاکٹروں نے درد کی تسکین کے لیے برانڈی کا پیگ تجویز کیا۔ علامہ نے اسے پینے سے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا:

قیام یورپ کے دوران بھی جس چیز کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا اب اس معمولی سی تکلیف کے لیے کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔ اور میں تو موت سے بچنے کے لیے بھی کسی حرام چیز کا سہارا لینے کا روادار نہیں ہو سکتا۔

۱۹۲۹ء میں جب آپ مدراس گئے تھے تو آپ کے اعزاز میں بسا ٹو ہوٹل میں ایک شاندار دعوت دی گئی بیرے نے علامہ کے گلاس میں شراب ڈالنی شروع کی تو انہوں نے اُسے منع کر دیا۔ کسی نے آپ سے پوچھا کیا آپ شراب پی لیتے ہیں؟ ہنس کر فرمایا۔ بالکل نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے انگلستان کے قیام کے دوران بھی شراب کا قطرہ نہیں چکھا۔ یہ سن کر آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے اُنہوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔"

اس سلسلہ کا سب سے زیادہ ایمان افروز واقعہ وہ ہے جو میاں محمد شفیع نے علامہ کے آخری لمحات کے متعلق بیان کیا ہے۔ رات کا پچھلا پہر تھا علامہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ سخت اضطراب کا عالم تھا۔ دراصل وقت نزع شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے

چاہا کہ خواب آور ٹیکہ لگائیں۔ علامہ پر نیم بے ہوشی طاری تھی ایک بار اشارے سے ٹیکہ لگوانے سے انکار کر دیا۔ جب ڈاکٹر کا اصرار بڑھا تو قدرے برہمی سے لیکن صاف آواز میں کہا۔ اس ٹیکہ میں افیون ہوتی ہے میں بے ہوشی کی حالت میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں موت کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال کی شگفتہ مزاجی

غالب کو اپنی گلفشانیٔ گفتار پر بڑا ناز تھا۔

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
پھر دیکھے میرا انداز گلفشانیٔ گفتار

اقبال بھی گلفشانیٔ گفتار میں غالب سے کم نہیں تھے اور پیمانۂ صہبا کی قید بھی نہیں تھی۔ وہ بچپن ہی سے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں طاق تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں، یورپ کے قیام کے دوران، لاہور چیف کورٹ کے بار روم میں، اپنے گھر کی محفلوں میں، غرض ہر جگہ، ہر محفل میں، اقبال کی گلفشانیٔ گفتار اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ذکرِ اقبال میں انہیں اپنے عہد کا سب سے بڑا (CONVERSATIONALIST) فن گفتگو کا ماہر کہا ہے ان کی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کی بھی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی تھیں۔

اقبال کی گلفشانیٔ گفتار اور شگفتہ مزاجی کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

اقبال ابھی مکتب میں زیر تعلیم تھے۔ ایک روز ذرا دیر سے سکول پہنچے۔ استاد نے

ٹوکا۔ اقبال دیر سے کیوں آئے۔ برجستہ کہا "جناب، اقبال ہمیشہ دیر ہی سے آتا ہے"۔

اقبال مولوی سید میر حسن سے ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔ بچپن تھا۔ بیٹر پال رکھی تھی اسے ہاتھ میں پکڑے رہتے اور پڑھتے رہتے۔ مولوی صاحب نے کہا:

"کمبخت، اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے"۔ اقبال نے کہا "حضرت ذرا پکڑ کر تو دیکھئے"

اقبال سیالکوٹ کے مشن اسکول میں پڑھتے تھے۔ مولوی میر حسن کے گھر کا سودا سلف لانا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب نے ایک بار دیکھا تو اشارۃً منع کر دیا۔ لیکن سعادت مندی کی وجہ سے اقبال سودا پھر بھی لاتے رہے ایک روز مولوی صاحب نے سودا لاتے دیکھا تو ناراض ہوتے فرمایا:

"اقبال میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تم میرے گھر کا سودا سلف نہ لایا کرو۔ تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں ہو"۔

اقبال نے سر جھکا کر عرض کیا:

"جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں"۔

طالب علمی کے زمانے کا قصہ ہے۔ ان کے ایک استاد کافی دراز قد تھے۔ لڑکوں نے مذاقاً ان کا نام ماسٹر جھنڈا رکھا ہوا تھا۔ اقبال بھی شرارتوں میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ طبیعت بھی موزوں تھی۔ ماسٹر صاحب کی شان میں ایک ہجویہ شعر کلاس کے دروازے پر چاک سے لکھ دیا۔ ماسٹر صاحب کلاس میں داخل ہوئے تو شعر پر نظر پڑی۔ بڑے چیں بجبیں ہوئے۔ بات کھل گئی۔ اقبال ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ آٹھ آنے جرمانہ ہوا جو اس زمانے کے لحاظ سے کافی رقم تھی۔ دوسرے دن اقبال ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرہ میں پہنچے۔ ایک روپیہ حاضر خدمت کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب

نے اٹھنی واپس دینے لگے تو اقبال نے سر جھکا کر کہا، جناب، باقی آٹھ آنے اپنے پاس ہی رکھیئے۔ ماسٹر صاحب کی شان میں ایک اور شعر بھی موزوں ہو گیا ہے۔ اس کا جرمانہ بھی پیشگی ادا کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال جب یورپ گئے تو وہاں تمام مشرق خصوصاً ہندوستان کے بارے میں جادو، درندوں اور سانپوں کی بہتات کے بارے میں عجیب وغریب قصے اور افسانے مشہور تھے۔ ایک مجلس میں ایک تیز وطرار خاتون اقبال سے پوچھنے لگیں: کیوں مسٹر، کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت ایک کوڑیالہ سانپ ہوتا تھا۔ اقبال نہایت سنجیدگی سے بولے۔ نہیں محترمہ، ہر روز نہیں۔ ہر تیسرے دن۔"

اقبال کی مداح اور دوست، عطیہ فیضی نے جو خود بھی کم ذہین اور حاضر جواب نہیں تھیں "اقبال" میں لکھا ہے:

اقبال بہت حاضر جواب ہیں۔ حاضرین پر مزاحیہ فقرے کسنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ زندہ دلی سے بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ اگرچہ لبااوقات ان کے مذاق میں طنز کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ۱۵۔ اپریل اور ۲۲۔ جون ۱۹۰۷ کی دعوتوں میں انہوں نے بہت زندہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ پارٹی کے افراد پر فی البدیہہ مزاحیہ شعر سنائے۔ جب میں نے ان اشعار کو قلم بند کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا۔ یہ وقتی نوعیت کے ہیں۔"

۲۹ جون ۱۹۰۷ کو میں نے اقبال کو ایک فیشن ایبل پارٹی میں دیکھا وہاں یہ لطیفہ ہوا کہ پُر لطف گفتگو جاری تھی کہ ایک بزخود غلط ہندوستانی خاتون مس وسر جینی داس بنی ٹھنی نہایت بھڑک دار کپڑوں میں ملبوس اور قیمتی زیورات اور ہیروں میں

لدی پھندی کمرے میں در آئیں اور ساری محفل کو نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا:

میں صرف آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔" اقبال نے برجستہ کہا:

"محترمہ یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہوگا اگر میں اس حادثہ سے جانبر ہو سکا۔" اقبال کے اس فقرے سے سب بے انتہا محظوظ ہوئے۔

عطیہ فیضی نے ہائیڈل برگ جرمنی میں علامہ کی حاضر جوابی اور خوش طبعی کے دو دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔

۲۵ اگست ۱۹۰۸ء کو ہم لوگ باغ فردوس کی سیر کے لیے گئے۔ اس باغ میں کسی بادشاہ نے تمام ممالک کی عبادت گاہیں جن میں ایک مسجد بھی تھی تعمیر کی تھیں جس عمارت کو مسجد بتایا جاتا تھا وہ بہت دلکش اور شاندار تھی۔ اس پر ہر جگہ لفظ اللہ عربی میں کندہ تھا اور قرآن کی مختلف سورتوں کی آیات بھی کھدی ہوئی تھیں ہر شخص یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ ان تحریروں کا مطلب کیا ہے۔ چونکہ سب کو معلوم تھا کہ اقبال عربی جانتے ہیں اس لیے ان سے کہا گیا کہ وہ پڑھ کر بتائیں کہ اس جگہ کی تاریخ کیا ہے۔ اقبال نہایت سنجیدگی سے آگے بڑھے کچھ دیر نظر جمائے پڑھتے رہے پھر بولے "میں بتاتا ہوں کہ اصل قصہ کیا ہے۔ ہوا یوں کہ جس بادشاہ نے یہ جگہ تعمیر کی تھی اُسے اتفاق سے ایک حور مل گئی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ حور نے کہا: میں ملکہ بننے کو تیار ہوں شرط یہ ہے کہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ایک مسجد تعمیر کریں جہاں ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔ بادشاہ نے شرط منظور کر لی مسجد تعمیر کروائی۔ یہیں ان کا نکاح پڑھوایا گیا تھا۔"

عطیہ لکھتی ہیں ہم ہندوستانی تو خوب ہنسے لیکن دوسرے حیرت زدہ رہے کہ

یہ مذاق ہے یا امرِ واقعہ۔

عطیہ بیگم نے جرمنی کے ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے ایک دن اقبال کی خوش شکل اور ذہین جرمن پروفیسرن جیمنسٹریم (ورزش گاہ) میں ورزش میں مصروف تھیں اور ورزشی ضرورت کے تحت فرالائن ویگے ناست عطیہ فیضی کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوتے تھیں۔ اتنے میں اقبال آگئے اور آکر ان خواتین کو سامنے کھڑے ہو گئے۔ حیرت سے بت کی طرح ساکت ہو گئے جب پوچھا گیا کہ اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا:

"میں یکایک ماہر علم نجوم بن گیا ہوں اس لیے تاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں"

عطیہ فیضی مزید لکھتی ہیں:

"اسی رات کو رات کے کھانے پر ہمارے یہاں ایک مہمان خاتون آئیں جن کے بال بہت خوبصورت اور سنہری تھے۔ اور چونکہ وہ بہت نوعمر تھیں اس لیے ان کے رخساروں پر نرم نرم سنہری روئیں زیادہ نمایاں تھے اقبال نے مجھے مخاطب کر کے اردو کا شعر پڑھا۔

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں
ہو طلائی استرا اسکے لیے

بذلہ سنجی کے اس دلچسپ مظاہرہ پر میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔"

یاد بخیر۔ کبھی علامہ کو ستار بجانے کا شوق بھی رہا تھا۔ ایک دن علامہ ستار بجانے میں مستغرق تھے کہ نواب سر ذوالفقار علی اور سردار جوگندر آگئے علامہ کو ستار بجاتے دیکھ کر سردار جوگندر سنگھ نے از راہ مذاق کہا جب دیکھو ستار گود میں لیے بیٹھے ہیں۔ یہ سُن کر علامہ کی رگِ ظرافت

پھڑکی اور انہوں نے پنجابی میں کہا "سلفنی جو ہوئی"

کیمبرج یونیورسٹی میں ایک دفعہ مذہب پر بحث چھڑ گئی ایک صاحب نے علامہ سے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ آج تک جتنے پیغمبر بھی اس دنیا میں آئے ایشیا ہی میں مبعوث ہوئے یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔" اقبال کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ بولے یہی بات دراصل یہ ہے کہ شروع شروع میں خدا اور شیطان نے اپنا اپنا بہترا جمایا۔ خدا نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو اس پر وہ صاحب بول اُٹھے":

تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟

اقبال نے کہا: آپ کے میکاولی شیطان کے پیغمبر نہیں تو کون ہیں؟

اسی طرح کی طنز کا ایک واقعہ ذکر اقبال میں درج ہے۔ ۱۹۳۲ء کی بات ہے غازی رؤف پاشا (سابق وزیر اعظم ترکی) جامعہ ملیہ دہلی میں توسیعی لیکچروں کے لیے آئے ہوئے تھے۔ علامہ نے بھی دو جلسوں کی صدارت کی۔ پہلے روز تو اتحاد اسلامی کے موضوع پر بصیرت افروز تقریر کی۔ دوسرے دن کی صدارت میں لوگ علامہ سے ایک فصیح و بلیغ خطبہ کی توقع لگائے بیٹھے تھے کہ علامہ اُٹھے۔ چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر بیٹھ گئے۔

پہلی جنگ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے اس سے اس بے شغلی کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا:

"آج کل مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔ اس لیے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔"

علامہ کی شگفتہ مزاجی کا جوہر ظرافت سے زیادہ طنز میں کھلتا تھا۔

علی بہادر حبیب اللہ یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹے تو علامہ اقبال سے ملنے کے لیے ان کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا:

"کیوں بھئی ولایت ہو آئے"؟

اس کے جواب میں اُنہوں نے فخریہ انداز میں کہا۔ میں تو آٹھ سال کی عمر میں ہی انگلینڈ چلا گیا تھا۔ یہ سُن کر علامہ مسکرائے" اور کہا" تو پھر یوں کہیئے ناکہ میموں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں"۔

جب جوانی تھی تو علامہ عملی مذاق کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے اس طرح کا ایک دلچسپ مذاق، علامہ کے پُرانے دوست اور ہم نشین مرزا جلال الدین کا بیان کیا ہُوا ملفوظات اقبال میں درج ہے:

لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے لکھنؤ گئے۔ اجلاس کے دنوں میں ایک شام ہم فارغ تھے اقبال جب بور ہونے لگے تو مجھ سے کہا چلو کہیں چل کے گھڑی دو گھڑی گانا ہی سُن آئیں۔ میں پہلے تو آمادہ ہو گیا مگر بعد کو کسی اچانک کام کی وجہ سے رک گیا وہ چل کھڑے ہوئے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد جب واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے لو آج تمہیں تماشا دکھائیں میں نے حیرت سے پوچھا آخر ہوا کیا؟ "ہونا کیا تھا بس آج مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا۔ جس مغنیہ کے ہاں ہم گانا سننے کے لیے گئے تھے وہیں کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب گانے سے جی بہلانے تشریف لے گئے تھے لیکن جب رخصت ہوئے تو گھبراہٹ میں کانفرنس کا دعوت نامہ وہیں چھوڑ آئے۔ اب جو ہم پہنچے

تو اس طوائف نے ازرہ ہمدردی وہ دعوت نامہ ہمارے سپرد کیا اور تاکید سے کہا جس طرح بھی ہو مولوی صاحب قبلہ کو تلاش کر کے ان کی امانت بحفاظت ان کے پاس پہنچا دیں۔ ہم نے حامی بھر لی۔ اب ہم نے سوچا ہے کہ یہ دعوت نامہ ہم کانفرنس کے صدر نواب وقار الملک، صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ پہنچائیں تاکہ ضابطہ کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب صاحب بھی دیکھ لیں کہ دنیا بھلی سے بھلی ہے اتنا کہہ کر اقبال نے کاغذ کا تختہ نکالا اور قلم لے کر نواب صاحب کو طوائف کی طرف سے ایک مفصل خط لکھ ڈالا اس میں شام کے واقعہ کی تمام تفصیل بے کم و کاست بیان کرنے کے بعد لکھا چونکہ بندی قبلہ مولوی صاحب کے پتے سے واقف نہیں اس لیے آپ سے التماس کرتی ہے کہ ان کا کھوج لگا کر ان کے کاغذات ان تک پہنچا دیں۔ اس خط کی بھنک مولوی صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ ہانپتے کانپتے اقبال کے پاس آئے اور بے طرح خوشامد کرنے لگے۔ اپنی عزت و آبرو کا واسطہ دیا معافی مانگی۔ پھر اقبال تو گویا اسی وقت کے منتظر تھے۔ "اب آتے ہو تو جاتے کہاں ہو" کے مصداق انہوں نے ان حضرت کو وہ رگیدا کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ اس غریب نے ناک سے نہ جانے کتنی لکیریں کھینچیں تب کہیں جان چھوٹی"۔

یاد رہے کہ یہ باتیں اس وقت کی ہیں" جبکہ آتش جواں تھا"۔

لیکن علامہ کی طبیعت کی شگفتگی زندگی کے آخری دور میں بھی باقی رہی ۱۹۲۲ء میں علامہ انارکلی والے بالاخانہ کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک نہایت بوسیدہ سی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔ عبدالمجید سالک ملنے آئے تو عرض کیا "حضرت، کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہیں ملتی تھی؟ فرمانے لگے "جی ہاں یہ تو صرف بہن دعاؤں کے

سہارے کھڑی ہے ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات نہیں۔"

لندن میں گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے بعد واپسی اٹلی میں قیام پذیر تھے۔ غالباً روم کا قصہ ہے وہاں کسی عورت نے جو اسلامی فنِ تعمیر کی دلدادہ تھی ایک مصنوعی جنت بنائی تھی اس نے علامہ کو بھی اس جنت کی سیر کرائی۔ پھر سیر کرانے کے بعد ان سے اپنی خود ساختہ جنت کے متعلق رائے لی۔ علامہ نے مسکرا کر کہا: جنت بھی ہے اور حور بھی کسر صرف ایک مردِ مومن کی ہے۔

مئی ۳۵ء میں والدہ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ بجھ کے رہ گئے تھے مختلف عوارض نے بھی ستا رکھا تھا۔ لیکن طبیعت کی فطری شگفتگی گل کھلاتی رہتی تھی۔ عبدالرشید طارق نے ملفوظاتِ اقبال میں لکھا ہے:

باتوں باتوں میں بات جنس کے موضوع کی طرف جا نکلی۔ علامہ مسکرائے اور کہا جب عورتیں میری شاعری پڑھتی ہیں تو وہ خیال کرتی ہیں کہ میں نوجوان ہوں۔ جاوید کی ماں کے انتقال کے بعد مجھے شادی کرنے کے کئی پیغام موصول ہوئے حال ہی میں ایک خط ایک ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی کی طرف سے آیا ہے جس میں اُس نے لکھا ہے کہ وہ میری شاعری سے کافی لطف اندوز ہوتی ہے اور مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے۔" میں نے اسے جواب میں لکھا "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم میری شاعری سے لطف اندوز ہوتی رہو، اور شادی کا خیال چھوڑ دو۔" عبدالرشید طارق کا بیان ہے کہ یہ واقعہ بیان کر کے علامہ خوب زور سے ہنسے۔ حاضرین بھی محظوظ ہوئے۔

علامہ نے ایک بار دوسری بیگم (سردار بیگم) کی فرمائش پر جاوید کو بکری کے بچے سے کھیلتے دیکھ کر چند مزاحیہ اشعار پنجابی میں فی البدیہہ کہے۔ بانگِ درا کے آخر میں علامہ کا ظریفانہ کلام بھی شامل ہے۔

باب سوم

اقبال اور پاکستان

(سیاسی زندگی)

- سیاسی زندگی کا جائزہ
- اقبال اور نظریۂ پاکستان
- خطبۂ الہ آباد
- اقبال کے خطوط قائداعظم کے نام
- قائداعظم اقبال کی نظر میں
- اقبال قائداعظم کی نظر میں

سیاسی زندگی

اگر سیاست کے وسیع تر مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی تمام شعوری زندگی سیاست میں حصہ لیتے گزری۔ یہ خیال خود علامہ کا بھی تھا وفات سے دو سال پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے ایک ملاقاتی بادشاہ حسین کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ سیاست کے میدان میں کیوں داخل ہوئے ہیں فرمایا:

"میرے سیاست میں داخل ہونے سے آپ کا کیا مفہوم ہے؟

میں پہلے بھی میدان سیاست میں تھا اور اب بھی ہوں۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود میری زندگی کا مشن رہا ہے۔ کیا یہ سیاست سے کوئی مختلف چیز ہے؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں عوامی رہنما نہیں تو یہ محض غلط فہمی ہے۔ میں نے اپنے کلام سے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ کیا میں نے مسلمانوں میں کمتری کے غلط احساس کو ختم نہیں کیا؟ کیا میں نے یہ تلقین نہیں کی کہ مسلمان مجاہد ہیں؟ کیا میں نے انجام کار اس برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا تصور نہیں دیا؟

پھر بھی علامہ کی سیاسی زندگی کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک سیاست میں نظری دلچسپی کا دور، دوسرا عملی دلچسپی کا دور۔

عملی سیاست میں تو اقبال نے حصہ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں لیا جب وہ ۲۳، نومبر ۱۹۲۶ء کو پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے اور جب ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ لیکن قومی سیاست سے ان کی نظری دلچسپی کا حتمی

ثبوت ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء سے ملتا ہے۔ جب انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک وہ انجمن کے سالانہ جلسوں میں اپنی قومی نظمیں پڑھتے رہے۔ لیکن یہ پہلا موقعہ تھا کہ قومی زندگی کے مسائل سے ان کی گہری دلچسپی کا ثبوت عام لوگوں کے سامنے آیا۔ کچھ عرصے کے بعد لاہور کی ایک ادبی مجلس میں شیخ عبدالقادر کی موجودگی میں انہوں نے اپنی پہلی وطنی نظم ہمالہ پڑھ کر سنائی جسے انہوں نے اپنے رسالہ مخزن کے اپریل ۱۹۰۱ء کے شمارے میں شائع کیا۔ یہ پہلی نظم تھی جس سے ان کی ملکی سیاست سے گہری دلچسپی ظاہر ہوئی اس نظم کا واضح رجحان وطن پرستی کی طرف تھا۔

ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت، نیا شوالہ، پرندے کی فریاد، صدائے درد، تصویر درد اس دور کی اہم ترین نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ خفتگان خاک سے استفسار بچے کی دعا، اور سر سید کی لوح تربت بھی ایسی نظمیں ہیں جن میں ان کے سیاسی خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ ان نظموں میں قومی اور ملّی دونوں احساس گھلے ملے ملتے ہیں۔ لیکن اونچی لے وطن پرستی کے جذبے کی ہے۔ اقبال اس زمانے میں متحدہ ہندوستانی قومیت کے علمبردار تھے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اسی جذبے کا اظہار ہے۔

متحدہ قومیت کو ماننے کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ فرقہ پرستی سے بیزار ہوتے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اور

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیا یہاں تو ایک قرب فراق آمیز ہے

ایسے خیالات کا اظہار فرقہ پرستی سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔
متحدہ قومیت کے اس نظریے سے ہر گریز کو، وہ وطن پرستی کے جذبے کے منافی سمجھتے ہیں۔

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

وطن پرستی اور متحدہ قومیت کے نظریے سے وابستگی کا یہ دور ۱۹۰۵ء تک شدت سے چلتا ہے ویسے متحدہ قومیت سے یہ وابستگی محض نظری تھی۔ عملی سیاست میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ کے قیام کے زمانے میں وہ علاقائی وطن پرستی کی مضرتوں سے آگاہ ہوئے۔ جب وہ واپس آئے تو وہ اسلام کے عالمگیر پیغام اخوت کے پیغامبر تھے۔ اور ہندوستانی سیاست میں ان کا نقطۂ نگاہ یکسر بدل چکا تھا۔ ۱۹۰۸ء سے بعد کے چند سال ان کی اپنی جذباتی زندگی میں بھی ناآسودگی اور اضطراب کے سال تھے اور ذہنی طور پر بھی وہ ایک تخلیقی کرب کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس کے باوجود ملی سیاست سے ان کی وابستگی کئی نظموں میں ظاہر ہوئی۔

۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس چھڑی تو اسی جنگ میں ایک کم سن مجاہدہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔ اقبال نے اس سانحہ پر اپنی مشہور نظم فاطمہ بنت عبداللہ لکھی۔

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں ترکوں کا بہت نقصان ہوا۔ ۲۹ جون ۱۹۱۲ء کو کانپور میں

ایک مسجد شہید کر دی گئی۔ مسلمانوں کا جانی مالی نقصان بھی ہُوا اور وہ حکومت کی نگاہ میں معتوب بھی ٹھہرے۔ ان ملی اور قومی حادثات کی بازگشت ان کی اس دور کی نظموں میں سُنائی دیتی ہے" شکوہ" ایسی معرکتہ الارا نظم اسی دور کی یادگار ہے۔

غرّہ شوال، یا ہلال عید کو بھی ایک سیاسی نظم کہنا چاہیے جب روس و برطانیہ کا اتحاد ترکی کے لیے ایک خطرہ بن گیا۔ ترکی میں سلطان عبدالحمید خان کو معزول کر کے سلطان محمدؒ نے خلافت سنبھالی تو اقبال اس سانحہ سے بہت متاثر ہُوئے ان کی سیاسی بصیرت نے دیکھا کہ اس کے پیچھے فرنگیوں کی عیاری کارفرما ہے۔

چاک کر دی، ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

شمع و شاعر فروری ۱۹۱۲ء کی یادگار ہے اس نظم میں بھی انہوں نے ان مصائب و آلام کی عکاسی کی ہے جو اس وقت عالم اسلام کو درپیش تھے۔ جون ۱۹۱۲ء میں انہوں نے مسلم نامی نظم میں حوصلہ افزا پیغام دیا۔

یاس کے عنصر سے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

جب جنگ بلقان کے زخمیوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے کی ایک تحریک شروع ہُوئی تو علامہ نے اس سلسلہ میں، جواب شکوہ، لکھا۔ پھر حضور رسالتمآب میں ایسی پرسوز اور دلگداز نظم لکھی اور خود لاہور کی بادشاہی مسجد میں پڑھی۔ اس نظم میں طرابلس کے خونیں واقعہ کی تشاندہی کی گئی ہے:۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

انگلستان سے واپسی سے پہلی جنگ عظیم تک اقبال نے اپنی سیاسی نظموں سے قومی اور ملی سیاست میں بالواسطہ بھرپور حصہ لیا وہ عملی طور پر کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے۔ لیکن ملی سیاست کے مسائل میں براہ راست دلچسپی لے رہے تھے۔

اقبال کے قیام انگلستان کے زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کر لی۔ یہ کمیٹی مسلم لیگ کی باقاعدہ شاخ نہ تھی بلکہ سر امیر علی کی سربراہی میں انگلستان میں مقیم تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمانوں نے ایک سوسائٹی قائم کی تھی۔ بعد میں اس سوسائٹی نے سیاسی حیثیت حاصل کر لی۔ اس طرح علامہ اقبال کا عملی سیاست سے یہ پہلا تعلق تھا۔ اس کمیٹی کی رکنیت سے پتہ چلتا ہے کہ انگلستان میں ان کے ذہنی رجحانات کی سمت کیا تھی۔

اقبال کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ میں قیام یورپ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بقول خود، یورپ کے تجربے نے انہیں مسلمان بنا دیا۔ وہ وطن پرستی کے تنگ حصار سے آزاد ہو گئے اور ان کے قلب و نظر کو فروغ انجمن حجاز نظر آنے لگا۔ لیکن فکر و نظر کی یہ انقلابی تبدیلی کوئی جذباتی رجعت پسندی نہیں تھی، مغربی تہذیب کے عوامل کے گہرے تجزیے اور اسلامی فلسفے کے عمیق مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نجات ان کے قومی تشخص کو مستحکم کرنے میں ہے اور یہ کہ اسلام ہی زندگی کی بہترین قدروں کا امین ہے۔

انگلستان ہی میں وہ کہنے لگے تھے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

اسلام کو امت کے اتحاد کی بنیاد پر سارے عالمِ اسلام کو متحد دیکھنے کی آرزو، کا اظہار واشگاف الفاظ میں کرتے ہیں۔

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

یہ وہی اقبال ہیں جنہیں چند سال پہلے خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آتا تھا۔ اب بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم جانے کا راستہ مل گیا ہے۔ اس زمانے میں ان کی فکر کا واضح رجحان ہندی مسلمانوں سے بڑھ کر تمام عالمِ اسلام کی طرف نظر آتا ہے

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار!
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
غم نصیبِ اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

اسلام سے وابستگی (COMMITMENT) کوئی نرا جذباتی دعویٰ نہیں بلکہ یہ ان کے گہرے ذہنی تجربے کا ثمر ہے۔

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

لیکن یہ درد بھی قومی درد ہے۔

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

اقبال کے خیالات میں یہ تبدیلی بہت واضح، گہری اور دور رس اثرات کی حامل تھی۔

۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آنے کے بعد اگرچہ انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا لیکن وہ عملی سیاست سے بالکل لاتعلق بھی نہیں رہے بلکہ وہ تعلق جو انہیں برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ سے ہوا تھا یہاں بھی قائم رہا۔ ان کے ایک قریبی دوست مرزا جلال الدین کے بیان کے مطابق انگلستان سے واپس آ کر انہوں نے پنجاب مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ شرکت محض اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کی خوشنودی خاطر نہ تھی بلکہ اس سیاسی عقیدے کی وجہ سے تھی کہ

"مسلمان کسی دوسری سیاسی جماعت میں مدغم ہو کر اپنی ملی حیثیت کو کھو دینے کے بجائے اپنی سیاسی تنظیم خود کریں"۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ محمد علی جناح سمیت سارے بڑے بڑے مسلمان رہنما کانگریس کے ممبر تھے اور متحدہ قومیت کا بول بالا تھا۔ باوجودیکہ ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق مل چکا تھا۔

ترانۂ ہندی: سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، سے ترانۂ ملی، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا، تک کا ذہنی سفر اقبال اس وقت طے کر چکے تھے جب علیحدہ مسلم قومیت کا عقیدہ، مسلم سیاست میں راسخ نہیں ہوا تھا۔ بڑے بڑے سکہ بند مسلم رہناؤں میں غالباً وہ تنہا اور نسبتاً کم معروف مدبر تھے جو اپنے فکر و فلسفے کی بنیاد پر علیحدہ مسلم قومیت کے عقیدے پر سختی سے کاربند تھے۔

جنگ طرابلس اور بلقان پر سیاسی نظمیں لکھنے کے بعد اگرچہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک اقبال ملکی اور قومی سیاست کے افق پر ابھرتے نہیں نظر آتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ قومی اور ملی سیاست کی فکری اور ذہنی بنیادیں بھر رہے تھے۔

۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی جب جنگ جاری تھی تو حکومت برطانیہ نے جنگ میں تعاون کرنے کے بدلے ہندوستان کو بہت سی مراعات دینے کی بڑی اُمیدیں دلائی تھیں۔ جو جون ۱۹۱۸ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ سے پوری نہیں ہوئیں۔ ہندوستان کے احتجاج کرنے پر سخت تعزیری کارروائیوں کے لیے حکومت نے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ اس سیاہ قانون کے خلاف سارے ملک میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوتے محمد علی جناح نے بھی احتجاجاً وائسرائے کی کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔

لاہور، پنجاب میں بھی جلسے ہوئے اور جلوس نکلنے لگے۔ ایک روز انارکلی بازار سے ایک احتجاجی جلوس نکل رہا تھا اور رولٹ بل ہائے ہائے کے نعرے لگ رہے تھے کہ حکومتی کارندوں نے مشتعل ہو کر گولی چلا دی۔ بہت سے قوم پرست شہید ہو گئے۔ ان شہیدوں کو فوجی گاڑیوں میں ڈال کر لے جایا جا رہا تھا۔ علامہ بھی اس زمانہ میں انارکلی میں رہتے تھے۔ انہوں نے بھی یہ روح فرسا نظارہ دیکھا۔ غصہ اور غم سے ان کا چہرہ تمتما یا ہوا تھا۔ علامہ کی بیوی (سردار بیگم) روتے روتے کہنے لگیں۔ ظالموں نے کتنی ماؤں کے لال موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ علامہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ آہستہ سے سر اُٹھا کر دل گیر لہجے اور گلوگیر آواز میں فرمایا:

"میرے مولا کو یہی منظور رہے سرتابی کی مجال نہیں وہ ان شہدا، کی قربانیاں ضرور قبول کرے گا۔ جنہوں نے عروس آزادی کی مانگ کے لیے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش کیا ہے"۔

اس روایت سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ گو وہ عملی سیاست سے

کنارہ گیر تھے لیکن ان کی ہمدردیاں جدوجہد آزادی کے ساتھ تھیں لیکن بحیثیت مفکر اور مدبر ہونے کے وہ ہنگامی سیاست کے تقاضوں سے آگے بھی دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔ اس کا اظہار تخلیقی و تعمیری شاعری میں ہوا۔ رموز بیخودی کے بعد وہ پیامِ مشرق کی تکمیل میں مصروف رہے۔ انقلاب روس کے پس منظر میں طلوعِ اسلام لکھ کر اقبال نے ثابت کر دیا کہ ان کی نظر ملکی ہی نہیں عالمی سیاست پر بھی ہے۔ اس دور کی یہ دو عظیم سیاسی نظمیں ہیں جن میں اسلام کو ایک زبردست تخلیقی اور تعمیری قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے لب و لہجہ کی تندی اور انداز بیان کے جوش و خروش سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مصنف خود ایک تازہ ولولہ اور جوش سے سرشار ہے اور کارزارِ عمل میں اترنے کو بیتاب ہے

۱۹۲۳ء میں اقبال نے خاص طور سے عملی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی۔ طلوعِ اسلام کی بشارتوں کی روشنی میں وہ شاید خود بھی عملی طور پر کچھ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ پنجاب اسمبلی کے انتخاب کے لیے کھڑے ہوتے۔ ۲۳۔ ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو انتخاب ہوا۔ کامیابی کا اعلان ۱۰ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ہوا۔ انہوں نے ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء سے ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء تک پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کی مختلف کمیٹیوں میں مثلاً فنانس، تعلیم، لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب سول میڈیکل سروس بورڈ وغیرہ میں نامزد رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ پنجاب اسمبلی میں ان کی اہم تقریروں کے اقتباسات گفتارِ اقبال، نامی کتاب میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰ جون ۱۹۲۷ء کو انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ یعنی جناح لیگ اور شفیع لیگ۔ جناح لیگ محمد علی جناح کی سربراہی میں اور شفیع لیگ سر میاں محمد شفیع کی قیادت میں کام کر رہی تھی تو اقبال، شفیع لیگ کے ساتھ تھے اور جناح لیگ کے ساتھ حریفانہ

کش مکش جاری تھی۔ اختلاف ذاتی نہیں نظریاتی تھا۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں جداگانہ انتخاب کے مسئلہ پر دونوں گروپوں میں اختلاف رائے پیدا ہوا تھا۔ محمد علی جناح ہندوستان کی آزادی کی خاطر ہر قیمت پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت پر تُلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہندو لیڈروں کی ایما پر انہوں نے دہلی میں مسلم رہنماؤں کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں ہندوؤں کو پیش کش کی گئی کہ اگر وہ مسلمانوں کے پانچ مطالبات تسلیم کریں اور مسلمانوں کے مفادات کو آئینی تحفظ مل جائے تو مسلمان جداگانہ حق انتخاب سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں۔ یہ تجاویز "تجاویز دہلی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اقبال نے جناح کی تجاویز سے سخت اختلاف کیا جس کا اظہار انہوں نے یکم مئی ۱۹۲۷ء کو منعقد ہونے والے ایک جلسہ میں برملا کیا اور ہندوستان کی اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر مخلوط انتخاب کو مسلمانوں کے لیے غیر موزوں اور جداگانہ انتخاب کو موزوں قرار دیا"۔

اس کے برعکس بعض بنیادی آئینی تحفظات کے ساتھ محمد علی جناح اس وقت تک مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور اس وقت کی ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "میں مخلوط انتخاب اور آبادی کے اصول پر نشستوں کا حامی ہوں۔ بحالت موجودہ ہندوستان کے مفادات کو جداگانہ انتخاب کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا اگر پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کے سوال پر ہندو راضی ہو گئے تو میں ذاتی طور پر مخلوط انتخاب کو ترجیح دوں گا، لیکن اقبال کسی قیمت پر جداگانہ انتخاب کا حق چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ کیونکہ یہی تو مسلمانوں کی جداگانہ قومی وجود کا ایک ٹھوس آئینی ثبوت تھا۔ جس کو مسلم لیگ نے ۱۹۰۹ء میں حاصل کیا تھا۔ اس کو چھوڑنا دو قومی نظریے کو چھوڑنا

تھا۔ جس کی نشاندہی سر سید بہت پہلے کر چکے تھے اور جس نظریے کی جڑیں اس سے بھی بہت پہلے حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوششوں اور شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کی احیائے دین کی جدوجہد تک پھیلی ہوتی تھیں اس نظریے کو اقبال اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں نظرانداز کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اقبال اور محمد علی جناح کے درمیان بنیادی اختلاف ۱۹۲۷ء کے سائمن کمیشن کے بارے میں تھا۔ جو 1919 کی مانٹیگو اصلاحات کا جائزہ لینے اپنے مقررہ وقت سے پہلے بھیجا گیا تھا۔ اس میں کوئی ہندوستانی ممبر شامل نہیں تھا۔ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ جناح کی قیادت میں مسلم لیگ نے بھی عدم تعاون کا اعلان کیا لیکن سر شفیع کی سربراہی میں اقبال نے ان سے اختلاف کیا۔ جناح اس مؤقف پر بڑی شدت سے قائم تھے کہ کمیشن سے تعاون نہ کیا جائے۔ انہوں نے ایک اخباری بیان میں کہا:

"تمام ہندوستانی اس کمیشن کا متفقہ طور پر بائیکاٹ کریں۔"

انہوں کمیشن کے قیام کو ہندوستانیوں کی عزتِ نفس پر حملہ قرار دیتے ہوئے کہا۔

"جلیانوالہ باغ میں ہمارے جسموں کو قتل کیا گیا تھا۔ سائمن کمیشن نے ہماری روحوں کو قتل کیا ہے۔"

علامہ اقبال، کمیشن سے تعاون کے حق میں تھے۔ اگرچہ انہوں نے (۹) اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کے شامل نہ کیے جانے کو ایک بہت بڑی غلطی قرار دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل بھی کیا جاتا تو وہ سر علی امام یا مسٹر جناح ہو سکتے تھے اور چونکہ یہ دونوں مخلوط انتخابات کے حامی ہیں۔ اس لیے پنجابی نقطہ نگاہ سے یہ بات موجب اطمینان تھی" یہاں پنجابی نقطہ نظر سے مراد مسلم اکثریتی صوبوں میں

حق خود ارادیت حاصل ہو سکنے کا امکان ہے۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے وفاق کو ایک عرصے سے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے تھے۔ اسی اصول پر انہوں نے لکھنؤ پیکٹ کے سوال پر متعدد مسلم رہنماؤں سے اختلاف کیا تھا۔

۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس میں اقبال کی موجودگی میں سائمن کمیشن سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس کے بعد علامہ اقبال نے ایک اخباری بیان میں کمیشن سے بائیکاٹ کو ملکی نقطہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطہ نگاہ سے علی الخصوص نقصان دہ قرار دیا۔ کمیشن سے تعاون کرنے سے علامہ اقبال کا نقطہ نظر یہ تھا کہ چونکہ ہندو مسلمانوں سے مفاہمت پر آمادہ نہیں ہو رہے اس لیے کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش کر کے ان کی پوزیشن کو مضبوط بنایا جائے۔ جبکہ محمد علی جناح خلوصِ دل سے یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے ہندوؤں سے آئینی مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے گی لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ محمد علی جناح مفاہمت کے لیے جتنے مخلص تھے اتنے ہندو نہیں تھے۔

۱۹۲۷ء کے اواخر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی جگہ اور صدارت پر مسلم لیگ کے رہنماؤں میں اختلاف ہو گیا اور مسلم لیگی رہنما دو حصوں میں بٹ گئے دونوں گروہوں نے اخبارات میں بیانات کے ذریعے اپنے اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔ اصل میں اختلاف کی تہہ میں طریق انتخاب اور حق خود ارادیت کا بنیادی مسئلہ تھا۔ کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کا مسئلہ بھی اسی جز کی ایک شاخ تھا۔

۱۹۲۷ء کے اواخر میں جب سائمن کمیشن کے آنے کا اعلان ہوا تو مسلمان رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ یکجا ہو کر ایسی تجاویز مرتب کریں جو ہندوؤں کے لیے بھی قابل قبول ہوں

اور حکومت کے سامنے بھی متفقہ مطالبات کی صورت میں پیش کی جا سکیں۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد محمد علی جوہر اور محمد علی جناح کی کوششوں سے مسلم رہنماؤں کی یہ کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں ہر مکتبِ فکر کے مسلم رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں محمد علی جناح نے محمد علی جوہر کے مشورے سے اپنی چودہ نکاتی تجاویز پیش کیں۔ جس کی پانچویں شق یہ تھی کہ ہر فرقہ کو جُداگانہ نیابت کا حق حاصل ہوگا۔ البتہ کوئی فرقہ از خود چاہے تو یہ حق چھوڑ سکتا ہے اس کے ساتھ یہ نکات بھی تھے کہ ہر صوبہ کامل طور پر مختار ہوگا۔ ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی ہوگا۔ اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم اکثریت کسی صورت میں متاثر نہیں ہونے دی جائے گی۔ یہ تجاویز جو (بعد کو تجاویز دہلی کے نام سے مشہور ہوئیں) متفقہ طور پر منظور کی گئی تھیں۔ لیکن پانچویں شق جس میں بعض شرطوں کے ساتھ جُداگانہ حق انتخاب سے دست بردار ہونے کے امکان پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی خود مسلم لیگ کی صفوں میں وجہ اختلاف بن گئی۔ سر میاں محمد شفیع، سر فضل حسین اور علامہ اقبال مخلوط انتخاب کو کسی صورت میں قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن محمد علی جناح کا خیال تھا کہ سندھ سے بمبئی کی علیحدگی اور سرحد و بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ سے ان پسماندہ صوبوں کے مسلمانوں کو جو سیاسی و معاشی فائدہ پہنچے گا۔ وہ مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کر لینے کے مفروضہ نقصان سے کہیں زیادہ ہوگا۔ بہر حال اس اصولی معاملہ میں شدید اختلاف ہُوا۔ اور مسلم رہنما دو حصوں میں بٹ گئے۔ محمد علی جوہر اور محمد علی جناح مکمل طور پر چودہ نکات کے حق میں تھے جبکہ سر محمد شفیع سر فضل حسن اور اقبال کو اس کی پانچویں شق سے شدید اختلاف تھا۔ اس اختلاف نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ اخبارات میں ایک دوسرے کے خلاف بیانات بھی

جاری کیے گئے۔

دونوں گروہوں میں دوسرا نزاعی مسئلہ سائمن کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کا مسئلہ تھا۔ دونوں محمد علی اور ان کے ہمنوا بائیکاٹ کے حق میں تھے۔ شفیع گروپ تعاون کے حق میں تھا۔ اقبال نے کھل کر چودہ نکات کی مخالفت کی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۷ء کو انقلاب میں بیان دیا کہ

"مسلمانان پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں۔"

اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو محمد علی جناح کے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے مؤقف پر سخت تنقیدی بیان جاری کیا۔ اسی بیان میں انہوں نے سعید امیر علی کے اس مشورے کا حوالہ بھی دیا کہ کمیشن سے تعاون کیا جائے۔

شفیع لیگ نے کمیشن سے تعاون کیا بھی۔ لیکن اس تعاون کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ۲۴ جون ۱۹۳۰ء کو اقبال نے سائمن کمیشن رپورٹ کی خامیوں پر شدید تنقید کی۔ اس بیان کا آخری حصہ ہے:

رپورٹ کی سفارشات کی تہہ میں جو پالیسی کارفرما ہے اس کا مطلب ہمارے نزدیک اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے"۔ حالات کی یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ اقبال نے سائمن کمیشن سے تعاون کر کے انگریزوں سے دادرسی اور انصاف کی جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور ادھر محمد علی جناح نے کمیشن کا بائیکاٹ کر کے اور مخلوط انتخابات کے

نہیں ہوئیں اور ادھر محمد علی جناح نے کمیشن کا بائیکاٹ کر کے

اور مخلوط انتخابات کے بنیادی حق کی بازی لگا کر ہندوؤں

سے جو تعاون کیا تھا اس میں انہیں بھی مایوسی ہوئی اور بہت جلد دونوں کو احساس ہو گیا۔ کہ مسلمانوں کا حق خود ارادیت نہ ہندو کے ہاتھ میں محفوظ ہے نہ انگریز کے۔ مسلمانوں کو خود اپنے علیحدہ قومی وجود کے منوانے کی جدوجہد کرنا پڑے گی۔

تجاویز دہلی (قائداعظم کے چودہ نکات) میں بعض شرائط کے ساتھ جداگانہ حق نیابت سے دست برداری کا امکان بھی موجود تھا۔ لیکن وفاقی آئین اور صوبوں کی خودمختاری کی نرم شرائط سے بھی (جن سے خود ہندوؤں کو بھی بہت فائدے تھے) ہندو مطمئن نہیں ہوتے اور دسمبر ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سالانہ اجلاس میں عملاً انہیں مسترد کر دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کی جائے جس میں چودہ نکات اور دوسری تجاویز نئے سرے سے زیر بحث آئیں۔ چنانچہ مئی ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اکثریت کٹر ہندوؤں کی تھی۔ چنانچہ جناح کے مفاہمتی چودہ نکات کو بھی مسترد کر دیا گیا اور پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک کمیٹی قائم کر دی گئی تاکہ ایک متفقہ آئینی دستور کا خاکہ تیار کیا جاتے۔ یہی کمیٹی بعد میں نہرو کمیٹی اور اس کی مرتب کردہ رپورٹ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جناح کے چودہ نکات میں سے ان تمام نکات کو رد کر دیا جن سے برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ ہو سکتا تھا۔ نہرو رپورٹ دراصل مسلمانوں کے سیاسی مفاد اور قومی وجود پر ایک بھرپور وار کی حیثیت رکھتی تھی۔

نہرو رپورٹ پر مسلمان رہنما تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ قوم پرست مسلمان رہنما اس کے حق میں تھے۔ مسلم لیگ کا ایک گروپ شوکت علی محمد علی کی رہنمائی میں اس کے سخت خلاف اور اس کو قطعی طور پر مسترد کر دینے پر مصر تھا۔ دوسرا گروپ جس میں محمد علی

جناح شامل تھے۔ اس میں مناسب رد و بدل کے بعد اسے قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ اس گروپ نے مسلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کو کچھ مزید رعایتیں دینے کی حمایت کی تاکہ کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلافات کی خلیج کو کم سے کم کیا جا سکے اور ہندو مسلمان متحدہ طور پر اپنی تجاویز سائمن کمیشن کو پیش کر سکیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ میں تمام ہندو مسلمان سیاسی جماعتوں کا آل پارٹیز کنونشن نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ محمد علی جوہر نے اس کی سخت مخالفت کی۔ محمد علی جناح نے نہرو رپورٹ کی اس خامی کی طرف اشارہ کیا جس کے تحت فرقہ وارانہ مسئلہ کو نظر انداز کیا گیا تھا اور اس کے ازالہ کے لیے اپنی چودہ نکاتی تجاویز اس میں شامل کرنے کی اپیل کی۔ فرقہ پرست ہندو تو اس رپورٹ کی اُن معمولی رعایتوں کے حق میں بھی نہیں تھے جو مسلمانوں کو دینے کی سفارش کی گئی تھی چہ جائیکہ قائدِ اعظم کی تجاویز قبول کرتے محمد علی جناح کی مفاہمتی تجاویز بھی مسترد کر دی گئیں۔ اس سے انہیں سخت صدمہ ہُوا اور وہ اپنے مؤقف پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے

نہرو رپورٹ، کانگریس اور آل پارٹیز کنونشن سے قطعاً مایوس ہو کر مسلم لیگ کے اقبال گروپ، خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء کے مقتدر رہنماؤں نے یکم جنوری کو ایک آل پارٹیز کانفرنس سر آغا خان کی صدارت میں منعقد کی۔ اس کانفرنس نے نہرو رپورٹ کے خلاف سخت احتجاج کیا اور اپنا نو نکاتی مطالبہ پیش کیا جس میں جداگانہ انتخاب کے حق کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

آل پارٹیز کانفرنس کی نو نکاتی قرارداد، اقبال کے اس مؤقف کی صداقت کا کھُلا ہوا ثبوت تھی۔ جس نکتہ پر وہ برسوں سے اصرار کر رہے تھے۔ آل پارٹیز کنونشن میں کانگریس

اور ہندوؤں نے جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا تھا اور جناح مسلم لیگ کی مصالحتی ترمیمات کو جس تعصب کے ساتھ مسترد کیا تھا اس سے گروپ کی ساری خوش فہمیاں دور ہو چکی تھیں اور وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکے تھے جو اقبال اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے دوسرے رہنماؤں کا مؤقف بن چکا تھا یعنی مسلمانوں کو حق خود ارادیت اور حق جداگانہ انتخاب کی بنیاد بنا کر اپنے قومی وجود کو مستحکم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چونکہ اب جناح لیگ، شفیع لیگ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا نقطہ نظر ایک ہو چکا تھا۔ اس لیے قائداعظم محمد علی جناح نے کوشش کی کہ دونوں گروپوں میں مصالحت ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے ان تمام زعماء سے مل کر اپنے معروف چودہ نکات مرتب کیے ان چودہ نکات میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی کی تجاویز شامل کر لی گئیں۔

ان چودہ نکات میں جداگانہ حق نیابت اور مسلم اکثریتی صوبوں کے مفادات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ جو ہمیشہ سے اقبال کا نقطہ نظر تھا۔ اقبال کی ان سیاسی خدمات کے پیش نظر انہیں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ تھی کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ کے بعد ہندوستان کی آئندہ دستور سازی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو شروع ہو چکی تھی اور اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر کو اس سیاسی موڑ پر وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم قومیت کے مسئلہ پر بڑی عالمانہ اور فاضلانہ بحث کی۔ اور جنوری ۱۹۲۹ء کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی تجاویز کی پرزور تائید کرنے کے بعد انہوں نے

اپنا وہ ذاتی نقطۂ نظر بھی پیش کیا جو اب نظریۂ پاکستان کے نام سے مشہور ہے۔
آپ نے فرمایا:

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام اَب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ مذہب کو فرد اور جماعت دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

..... مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک قوم آباد ہو وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب ایک دوسرے سے الگ ہیں.....

غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں کوئی ایک قوم آباد نہیں۔ اس لیے یہ کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم ہو کے رہے گی۔"

اقبال کا یہ مطالبہ وقتی اور جذباتی نوعیت کا نہیں تھا۔ اس کا ایک واضح پسِ منظر تھا۔ جو اقبال کے تعلیمات اسلامی، مذاہب عالم اور تاریخ انسانیت کے گہرے اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا۔

اس خطبہ کے شروع میں خود انہوں نے کہا:

میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور

ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی روح سے رہا ہے میں نے یہ بصیرت پیدا کر لی ہے کہ میں اس حقیقت کا ادراک کروں کہ ایک عالم گیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی قسمت کیا ہے۔

اس بیان کی صداقت کا ثبوت وہ فاضلانہ اور عالمانہ خطبات ہیں جو وہ انگریزی میں ۱۹۲۹ء میں مدراس اور علی گڑھ میں دے چکے تھے علامہ اقبال شمال مغربی ہندوستان کے اکثریتی علاقوں کو ملا کر جو ریاست بنانا چاہتے تھے وہ خالصتاً اسلامی ریاست ہے فرماتے ہیں:

میں اسلام کے فروغ کی خاطر ایک مربوط اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ ہندوستان دُنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔

اقبال کا یہ خطبہ نہ صرف پاکستان کی فکری بنیاد ہے بلکہ تمام عالمِ اسلام میں اسلام کی نشاۃ نو کا منشور بھی ہے۔

خطبہ الہ آباد اقبال کی سیاسی و فکری بصیرت کا لازوال خزانہ ہے ان کی بیشتر شاعری کی طرح اس کے مضمرات بھی آنے والے زمانوں میں کھلیں گے۔

خطبہ الہ آباد کے وقت پہلی گول میز کانفرنس جاری تھی۔ اس خطبہ کی انقلابی تجاویز کی برطانوی اور ہندو پریس میں بڑے پیمانے پر معاندانہ تشہیر ہوئی۔ اس کی گونج کانفرنس

کے ایوان میں پہنچی اور مسلم نمائندوں نے اپنے رویے میں ضروری سختی پیدا کرلی ورنہ وہ اس سے پہلے جداگانہ انتخاب کے حق سے بھی بعض تحفظات کے ساتھ دست بردار ہونے کو تیار ہو گئے تھے۔

علامہ اقبال اور دوسرے اہم رہنماؤں نے گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کے نام تار بھی بھیجے کہ جداگانہ انتخاب کے حق سے ہرگز دست بردار نہ ہونا چاہیے۔ مزید یہ تجویز کی شمالی ہند یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس فوراً بلائی جائے جس میں دہلی کانفرنس کی تجاویز کی پرزور حمایت کی جائے۔ اس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کے حق خودارادیت پر آنچ نہ آنے دی جائے۔

۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس ناکامی پر ختم ہو گئی۔ اقبال اس کانفرنس کی کارروائی سے قطعاً مطمئن نہیں تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک ہوئی۔ علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں ایک رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ علامہ اقبال شروع ہی سے ہندوستان کی مسلم سیاست میں ایک خاص مگر جداگانہ مکتبِ خیال کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کا بنیادی مؤقف یہ تھا کہ ہندوستان کی سیاسی ہیئت میں مسلمانوں کی قومی انفرادیت قائم رہے اور ان کی حیثیت دوسری جماعتوں میں مدغم نہ ہونے پائے۔

جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے ایک اخباری نمائندے نے آپ سے اس کانفرنس میں شرکت کے مقصد اور خاص پیش کش کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

"میرے پاس کچھ اور نہیں ہے لیکن قرآن ہے میں اسی کو پیش کر دوں گا۔"

دوسری گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کے سربراہ آغا خان تھے۔ اقبال نے اپنے وفد کی نمائندگی اقلیتوں کی کمیٹی میں کی۔ وہ آغا خان کو مختلف مسائل میں صلاح مشورہ بھی دیتے رہے ان کا بنیادی مؤقف یہ تھا کہ مسلم وفد مسلم کانفرنس دہلی کی قرار داد سے تجاوز نہ کرے مسلمانوں کے حق خود ارادیت اور جداگانہ انتخابات کے حق پر قائم رہے۔ لیکن ہندوؤں سے فرقہ وارانہ مسئلہ پر مفاہمت نہ ہو سکی۔ کانفرنس کے مباحث اور مسلم وفد کی پوزیشن نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ اقبال مسلم وفد سے رسمی طور پر کنارہ کش ہو گئے اور جب انہیں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کی قرار داد پہنچی تو ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء کو وہ کانفرنس سے قطع تعلق کر کے واپس ہندوستان روانہ ہو گئے۔

دوسری گول میز کانفرنس میں اقبال نے مسلمانوں کے قومی وجود کو مستحکم کرنے کے لیے جو پرجوش حصہ لیا اور جو ٹھوس مؤقف اختیار کیا اس سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے جو خطبہ الہ آباد کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں انہیں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس بصیرت افروز خطبہ میں علامہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی پر زور دیتے ہوئے کہا:

یہ آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے جو ممکن ہے کہ تمام ہندوستان پر بلکہ سارے ایشیا پر چھا جاتے یہ اس سیاسی تہذیب کا ناگزیر نتیجہ ہے جو انسان کو محض ایک "شئے" تصور کرتی ہے جس کا ناجائز استحصال کرتی ہے اور جس کی نظر میں انسان ایک ایسی شخصیت نہیں جس کو خالص تہذیبی طاقتوں کے ذریعے پروان چڑھایا جائے۔ ایشیاء کے عوام لازماً اس خون چوسنے والی معیشت کے خلاف جسے مغرب نے ترقی دی ہے اور ایشیا کی اقوام پر مسلط کیا ہے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایشیا موجودہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی

بے لگام انفرادیت کو قبول نہیں کر سکتا۔" اس خطبہ میں اقبال نے پر زور الفاظ میں حکومت پر واضح کیا کہ مسلمان دہلی مسلم کانفرنس کے مطالبات سے کم پر راضی نہ ہوں گے جن میں بنیادی حیثیت جداگانہ انتخاب، اور مکمل صوبائی خود مختاری کو حاصل ہے۔

اور آخر میں مسلمانوں سے کہا:

کسی فریق سے توقعات وابستہ نہ کرو اگر تم اپنی تمناؤں کو بار آور ہوتے دیکھنا چاہتے ہو۔ تو اپنی خودی کو اپنے اندر بیدار کرو اور اپنی خاکِ تمنا کو پختہ کرکے اسی سے اپنے میں جو ہر مردانگی پیدا کرو۔ سخت بن جاؤ اور سخت کوشی اختیار کرو۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا یہی راز ہے۔ اسلام کے لیے ایک ایسے موقف کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنا ہمارا مطمع نظر ہے جس سے ایسے مواقع حاصل ہو جائیں کہ وہ اسلام اپنے مقاصد کو اس ملک میں پھلتا پھولتا دیکھے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس نصب العین کی روشنی میں قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو ابھارا جائے اور ان کی موجودہ منتشر قوتوں کو از سرِ نو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ اس کو اپنی ہی روح کے شوالہ میں فروزاں کرنا چاہیے۔ اس کے لیے سرگرم تیاری اور ایک مستقل لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لائحہ عمل جزواً سیاسی اور جزواً ثقافتی (کلچرل) ہونا چاہیے اس کے بعد آپ نے حسب ذیل لائحہ عمل مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

۱۔ مسلمانانِ ہند کا ایک ہی لچکدار سیاسی ادارہ ہو۔ جس کی شاخیں تمام صوبوں میں ہوں جس میں ہر مکتب خیال کی نمائندگی ہو۔

۲۔ اس مرکزی سیاسی ادارے کے تحت پچاس لاکھ روپیہ کا ایک قومی فنڈ فراہم کیا جائے۔

۳۔ نوجوانوں کی ایک رضا کار جماعت تیار کی جائے جو دیہات میں معاشرتی و معاشی سدھار کا کام کرے۔

۴۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو اسلامی تعلیمات کو پھیلائیں ان اداروں کا سیاسیات سے تعلق نہ ہو۔

ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں علماء اور وہ مسلم وکلاء جنہوں نے جدید قانون کی تعلیم پائی ہو۔ شامل ہوں اس جماعت کا مقصد یہ ہو کہ حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں اور اس کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی توسیع اور ضرورت ہو تو اس کی از سر نو تعمیر کرے۔ اس جماعت کو ملک کے دستور میں تسلیم کیا جائے۔ تاکہ کوئی مسودۂ قانون جس کا اثر مسلمانوں کے شخصی قانون پر پڑتا ہو اس وقت تک مجلس قانون ساز میں پیش نہ کیا جائے جب تک اس مسودے کو اس جماعت کی منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ اس مخصوص عملی مقصد کے علاوہ اس مجلس کے قیام کے باعث تمام دنیا کے باشندے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اسلامی قانون، کی وسعت، سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اس کی افادیت اور موجودہ بحران میں اس کی قدر و قیمت سے بہتر طریقے پر واقف اور مستفید ہو سکیں گے۔

یہ نسبتاً کم مشہور خطبہ بھی علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے۔ اس میں ایک طرف انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی حمایت کی اور دوسری طرف پرزور طریقے پر نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کی بلکہ نہایت فراست کے ساتھ ان کی رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیے اور ایک نہایت جامع لائحہ عمل بھی پیش کیا۔

علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس پر سخت نکتہ چینی کی تھی اس سے حکومت

وقت ان سے خوش تو نہیں تھی لیکن انہیں ہندوستان کی عام سیاست اور بالخصوص مسلمانوں کے سیاسی معاملات میں جو اہمیت حاصل ہو چکی تھی اس کے پیش نظر حکومت نے بادل نخواستہ ایک بار پھر انہیں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہوئی۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے سے پہلے علامہ اقبال نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ایک بیان میں کہا:

میں مسلمانان ہند اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی طاقت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کرے گا۔ مسلمانوں کو میں خصوصیت سے یاد دلاؤں گا کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں پر کاربند رہیں اور قرآن کریم کا وہ اصول یاد رکھیں "جب تو نے ایک طریق عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو فوراً عمل شروع کر دے اور خدا پر بھروسہ رکھو"۔

تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال نے بہت کم حصہ لیا۔ کانفرنس میں زیادہ تر بحث کل ہند وفاق اور اس کے متعلقہ امور پر ہوتی رہی جب انہیں اظہار خیال کا موقعہ ملا تو انہوں نے سرے سے وفاق کے تصور کی ہی مخالفت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاق ہی کیوں نہ ہو) قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبے کو خود مختار اور آزاد بنا دیا جائے اور اس کا تعلق بجائے ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔

تیسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر علامہ اقبال نے برطانیہ کے ارباب فکر و دانش کو تقسیم ہند یا اسلامی ہند کی اس تجویز کی معقولیت کا یقین دلایا جو وہ اسے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں پیش کر چکے تھے۔

گول میز کانفرنسوں میں اپنی شرکت کے بارے میں انہوں نے خود فرمایا" میں ملک کی سیاست میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے شامل نہ ہوا تھا بلکہ محض اس لیے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاسی میں مسلمانوں کو دوسری اقوام ہند میں مدغم نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اس کے سوا گول میز کانفرنسوں کی کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔

علامہ اقبال نے مارچ ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس وقت مسلمانان ہند کی سیاست میں یہی جماعت پیش پیش تھی۔ اور عملی طور پر صرف یہی ایک مؤثر سیاسی تنظیم تھی۔ یہ زمانہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں بہت اہم زمانہ تھا۔ دستوری تجاویز نے گول میز کانفرنس کے مراحل کو اسی زمانے میں طے کیا تھا۔ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) جس نے مستقبل کی تاریخ میں مسلمانوں کے مؤقف کو متعین کر دیا اسی زمانہ میں صادر ہوا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا دورِ صدارت بہت ہی اہم ذمہ داریوں کا حامل تھا جنہیں انہوں نے بہت کامیابی سے پورا کیا۔

اس دوران ان کی تمام تر توجہ اس امر پر مرکوز رہی کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کے لیے بحیثیت جداگانہ قوم کے، جداگانہ حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اصل میں مسلم کانفرنس اور علامہ اقبال کی ساری جدوجہد کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں نئے آئین میں دوسری قوموں میں مدغم ہونے سے بچایا جائے اور اس عظیم مقصد میں انہیں مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔

مسلمانوں کے مؤقف کے خاص نکتے یہ تھے۔

مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق ہر صورت برقرار رکھا جائے۔

- سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔
- سرحد میں اصلاحات کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔
- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔
- صوبائی اور مرکزی کابینہ میں مسلمانوں کو ان کا جائز حصہ دیا جائے۔

۱۹۳۵ء کے نئے آئین میں ان سب مطالبوں کا لحاظ رکھا گیا۔ صوبوں اور مرکز میں اختیارات کی تقسیم میں بھی مصالحتی انداز اختیار کیا گیا۔ صرف دو مطالبے ایسے تھے جنہیں نئے دستور نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ایک تو بلوچستان کو دوسرے صوبوں کی سطح پر نہیں لایا گیا۔ دوسرے پنجاب اور بنگال کی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے حساب سے نشستیں نہیں دی گئیں۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ زمانہ مسلمانوں کے جماعتی انتشار کا تھا۔ محمد علی جناح تک گول میز کانفرنس کے وقت سے ہندوستانی سیاست سے کنارہ کش ہو کر انگلستان کی پریوی کونسل میں وکالت شروع کر چکے تھے۔ مسلم لیگ بے جان اور بے اثر تھی۔ مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی مسلم کانفرنس کر رہی تھی۔ جس کی صدارت مارچ ۱۹۳۲ء میں اقبال نے کی تھی اور اپنے بصیرت انگیز خطبے میں مسلمانوں کے لیے سیاسی اور معاشری لائحہ عمل تجویز کیا تھا۔ اس جماعتی انتشار سے خود اقبال بھی بہت دل گیر تھے۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے خود اُن کی اپنی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی تھی۔ عملی سیاسی تگ و دو سے کنارہ گیر ہو گئے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی دُنیا میں ایک طرح کا قیادتی خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اور ۱۹۳۵ء کے آئین کی آمد آمد تھی اس لیے لیاقت علی خان اور دوسرے درد مند مسلمانوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ

ہندوستان آکر مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ چنانچہ اواخر ۱۹۳۴ء میں محمد علی جناح ہندوستان اور مسلم لیگ کی بکھری ہوئی تیلیوں کو اکٹھا کر کے تعمیرِ آشیان کرنے لگے۔

اپریل ۱۹۳۶ء کے اوائل میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہوا۔ جس میں نئے دستور کے تحت صوبائی انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمانی بورڈ قائداعظم کی صدارت میں قائم ہوا اور انہیں اختیار دیا گیا کہ وہ مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں قائم کریں۔

مسلم لیگ کے جھنڈے تلے صوبائی پارلیمانی بورڈ قائم کرنا آسان کام نہ تھا۔ چونکہ مسلم اکثریتی صوبوں میں خصوصیت سے مسلم لیگ کی تنظیم بہت کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

اپریل ۱۹۳۶ء کے اواخر میں قائداعظم محمد علی جناح لاہور گئے اور سب سے پہلے پنجاب کے سب سے مقتدر لیڈر سر فضل حسین سے لیگ کی جانب سے پنجاب پارلیمانی بورڈ بنانے کے لیے کہا۔ انہوں نے بڑی بے رُخی سے ہر طرح کے تعاون سے انکار کر دیا۔ قائداعظم نے مایوس ہو کر علامہ اقبال سے رجوع کیا تو انہوں نے بڑی خوشی سے یہ خدمت قبول کر لی اور پوری امداد و اعانت کا وعدہ کیا۔ چند دن بعد ہی علامہ اقبال کی صدارت میں پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم ہو گیا اور بورڈ کی طرف سے ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو ایک اخباری بیان جاری کیا گیا۔ جس میں انتخاب لڑنے کے عزم کے ساتھ قائداعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا اور مسلم عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ خود دار اور قوم کے وفادار نمائندے منتخب کریں۔

اقبال کی اپنی صحت مسلسل گرتی چلی جا رہی تھی۔ طویل علاج معالجہ جاری تھا اس

کے باوجود انہوں نے اپنی محدود سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مئی ۱۹۳۶ سے ۱۹۳۷ تک وہ قائداعظم کو برابر نہایت اہم خطوط لکھتے رہے اور سیاسی صورتِ حال کا تجزیہ کر کے قائداعظم کی رہنمائی پاکستان کے مطالبے کی طرف کرتے رہے۔ اس زمانے میں ان کی بینائی اس حد تک کمزور ہو چکی تھی کہ خود لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ نہایت اہم نظریاتی خطوط لکھواتے رہے اور اپنے بسترِ علالت بلکہ بسترِ مرگ سے جب تک جان میں جان رہی مسلمانوں کی فکری و سیاسی رہنمائی فرماتے رہے۔

یہ ایک مختصر خاکہ اقبال کی سیاسی زندگی کا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ سیاست کے میدان میں بھی ان کی فراست اور بصیرت بے مثال تھی۔ اصل میں وہ سیاستدان سے بڑھ کر ایک سیاسی مدبر تھے اور اس سے زیادہ ایک سیاسی مفکر۔

اقبال اور نظریہ پاکستان

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ پاکستان بنانے کا خواب سب سے پہلے علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ بنیادی طور پر تو یہ غلط نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ خواب سے صحیح حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس سے ذہن میں ایک طرح سے غلط تاثر پیدا ہوتا ہے۔ خواب، ایک غیر حقیقی چیز ہوتی ہے۔ لاشعور کی غیر منطقی، غیر مربوط، تخلیقی پرواز۔ خواب ایک خیالی، غیر حقیقی، ناقابلِ حصول خواہش کا اظہار بھی ہو سکتا ہے۔ اقبال نے پاکستان کے بارے میں جو سوچا، جو سمجھا، اور جس طرح بتدریج ایک نظریے کی شکل دی اُسے خواب نہیں کہا جا سکتا۔

برصغیر کے دوسرے سیاست دانوں کی طرح، اقبال بھی شروع میں (خصوصاً ۱۹۰۵ء میں یورپ جانے سے قبل) محض ایک قوم پرست تھے۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کے علم بردار، سیکولر نقطۂ نظر کے حامی، خاکِ وطن کا مجھے ہر ذرہ دیوتا ہے، اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، اسی دور کی پیداوار ہیں۔ انگلستان اور جرمنی میں قیام کے دوران وہ علاقائی قوم پرستی کے مضمرات سے آگاہ ہوئے اور اسلامی فلسفے اور تاریخ کے گہرے مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد اسلام ہے۔

پاکستان کا اصل اصول یہی نظریہ، یہی عقیدہ ہے۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی وہ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی مسائل کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے تھے۔

۱۹۱۰ء تک مسلمان قومیت کا نظریہ بہت واضح طور پر ان کے ذہن میں ڈھل چکا تھا۔ اس کا ثبوت وہ انگریزی لیکچر ہے جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں ۱۹۱۰ء کے آغازِ سرما میں دیا تھا جس کا ترجمہ مشہور رہنما مولانا ظفر علی خان نے ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے عنوان سے کیا اس میں اقبال نے کہا تھا:

قومیت کا اسلامی تصور مغربی اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی، اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزی اور جرمن کو جرمنی سے ہے۔ وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔

اقبال اپنے عقیدے میں اتنے راسخ ہو چکے تھے کہ جب ۱۹۲۸ء میں انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا اور پنجاب کی قانون ساز کے ممبر منتخب ہو گئے تو انہوں نے اسمبلی میں کہا:

"متحدہ قومیت کی گفتگو بے سود ہے اور شاید عرصے تک ہی رہے ۔ پچھلے پچاس سال سے یہ الفاظ لوگوں کی زبان پر ہیں ۔ یہ چیز ایک مرغی کی طرح کڑ کڑاتی تو بہت رہی ہے لیکن انڈا ایک نہیں دیا ۔"

"میں نہیں جانتا کہ ایک قوم بنا پسندیدہ ہے بھی یا نہیں یہ ایک چیز ہے جس کو رد بھی کیا جا سکتا ہے" ۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن آمد کے پس منظر میں جب مسلم لیگ ہندوؤں سے سیاسی مفاہمت کی خاطر اسے مطالبات (جس میں جداگانہ انتخاب کا حق سر فہرست تھا) کچھ لچک پیدا کرنے پر آمادہ ہو گئی ۔ تو اقبال نے مرکزی مسلم لیگ سے کٹ کر محض اصول کی خاطر ایک متوازی مسلم لیگ قائم کر لی جو شفیع لیگ کے نام سے موسوم ہوئی ۔ علامہ اقبال اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے ۔ اس لیگ نے دسمبر ۱۹۲۸ء آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی تشکیل میں حصہ لیا ۔ جس نے چودہ قومی مطالبات کا اعلان کیا یہ وہی مطالبات تھے جو بعد میں جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے ۔ اقبال کے ذہن میں مسلم قومیت کی بنیاد پر اسلامی مملکت کا تصور نمو پاتا رہا ۔ سیاسی زمین تیار کرنے کے ساتھ ساتھ وہ فکری اور نظریاتی زمین ہموار کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے اس کا ثبوت ۱۹۲۹ء کے لیکچر ہیں جو انہوں نے انگریزی میں مدراس اور علی گڑھ میں دیئے ۔ جو اسلامی الہیات کی تشکیل جدید (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے نام سے عالمگیر شہرت پا چکے ہیں ۔ ان خطبات کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اصول و اقدار کو عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا جائے ۔ ایک خطبے میں انہوں نے دلائل کے ساتھ ثابت

کیا کہ اسلامی تصور مملکت کا تصور ایسی شکل اختیار کر سکتا ہے کہ وہ جدید تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔

ان عالمانہ خطبات میں منجملہ دوسری چیزوں کے اسلام کو ایک تہذیبی نظام کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۰ء کے علی گڑھ کے خطبہ کے زمانے سے وہ جس رُخ پر غور و فکر کر رہے تھے۔ اس کی منزل یہی تھی کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں علیحدہ آزاد مسلم ریاستوں کا مطالبہ کریں۔

۱۸ر جولائی ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں انہوں نے لکھا:

اگر ملک کے ایک حصے میں ایک اسلامی سٹیٹ قائم ہو جائے تو معاشرتی زندگی بہت جلد سنور سکتی ہے۔

اس خط میں بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال کی فکر اس سمت میں ایک عرصے سے حرکت کر رہی تھی۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں لندن میں ہندوستانی رہنماؤں کی ایک گول میز کانفرنس بلائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ آنے والی آئینی اصلاحات کا ایک خاکہ تیار کیا جائے۔ اس زمانے میں انگلستان میں ہندو نواز لیبر پارٹی کی حکومت تھی۔ اس کی شہ پر ہندوؤں نے اپنا رویہ سخت کر لیا۔ مسلمان رہنما مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے اصولی موقف میں بھی لچک پیدا کرنے پر بھی آمادہ نظر آنے لگے۔ یعنی بعض تحفظات کی عوض وہ جداگانہ انتخاب کے بنیادی حق سے بھی دست بردار ہونے پر راضی تھے۔ ان تحفظات کا بھی بیشتر فائدہ مسلم اقلیتی صوبوں کو پہنچتا تھا۔ اور مسلم اکثریتی صوبوں کی سیاسی پوزیشن مزید کمزور ہوتی تھی۔ اسی صورت حال سے علامہ اقبال کی تشویش قدرتی تھی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسلم اکثریتی صوبے اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم

بنائیں۔ چنانچہ ان ہی کے ایما پر پنجاب کے مسلم پریس نے ایر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تحریک شروع کی۔ مسلم پریس کا نعرہ تھا۔ "پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں ان میں اسلام کا علم بلند کرو"۔ اسی ایر انڈیا مسلم کانفرنس کی تحریک کی طرف سے علامہ اقبال اور دوسرے مسلمان رہنماؤں اور دانشوروں کے دستخطوں سے اعلان جاری کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان (مسلم اکثریتی) صوبوں کے مسلمانوں کو حالات حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان کی حاکم قوم کی حکمت عملی سے واقف کر کے ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جن سے اس وقت ملت اسلامیہ دو چار ہے، اور اس کے بعد مسلمانان ہند کی اس کثرت کو جو ان صوبوں میں ہے۔ (جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں۔ بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے جو ارباب علم و دانش پر روز بروز عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یکجا کر رکھا ہے) ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہونے کا پیغام دیا جائے"۔

یہ کوئی چائے کی پیالی کا طوفان نہ تھا۔ اس تحریک کی لہریں لندن کی گول میز کانفرنس تک پہنچیں۔ اس کانفرنس کے زبردست پرچے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ گول میز کانفرنس کے مسلم رہنما بھی ہندوؤں کو مراعات دینے میں محتاط ہو گئے۔ ایر انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد دسمبر ۱۹۳۰ء کے اواخر میں ہونا تھا کہ اتنے میں آل انڈیا مسلم لیگ نے علامہ کو الٰہ آباد میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب کر لیا اور ایر انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس جنوری ۱۹۳۱ء تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

نظریہ پاکستان کے سلسلہ میں فکر اقبال کے اس مختصر تاریخی جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے

کہ خطبہ الہ آباد ایک شاعر کا خواب نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک عظیم مفکر، اور مدبر کی برسوں کی فکر و تدبر کا منطقی نتیجہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جب انہوں نے گنگا جمنا کے سنگم پر یو پی کے مشہور شہر الہ آباد کے ایک گنجان مسلم محلہ کی ایک عمارت "دواز دہ منزل" کے وسیع و عریض ہال میں اپنا تاریخی خطبہ پڑھا تو اس تاریخ سے بہت پہلے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمان قطعاً ایک علیحدہ قوم ہیں اور یہ کہ ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل پاکستان ہے۔

برعظیم کی سیاسی تقسیم کے تصور میں کوئی نئی بات نہیں تھی مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ہفت روزہ اخبار "مہذب" میں ۱۸۹۰ء میں ہی (ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے) اس طرف اشارہ کر دیا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی نے ہفت روزہ "کامریڈ" میں ایک تحریر چھاپی تھی جس میں تقسیم کے ساتھ ساتھ تبادلہ آبادی کا بھی تذکرہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ کے خیری برادران نے یہی تصور پیش کیا۔ ۱۹۲۰ء میں عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی جی کے نام ایک کھلے خط میں علاقائی تقسیم کا ایک منصوبہ بھی دے دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی نے ایک کتابچے میں یہی تجویز پیش کی۔ ۱۹۲۳ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار گل خان نے ایک سرکاری کمیٹی کے سامنے علیحدہ مملکت کے قیام پر زور دیا۔ ۱۹۲۴ء میں حسرت موہانی نے اپنا منصوبہ پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء میں ہندو لیڈر لالہ لاجپت رائے نے علیحدہ مسلم مملکت کا نقشہ پیش کیا وغیرہ۔

لیکن ان سب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ روزمرہ اختلافات کے پیشِ نظر ہندو مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ان کے علاقے الگ الگ کر دیئے جائیں۔ یہ ایک منفی انتظامی حل تھا اس کی ٹھوس نظریاتی بنیاد کسی نے مہیا نہیں کی تھی۔ سوائے ایک استثنائی صورت کے۔ ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی کے مسئلہ پر بنارس کے ہندوؤں کے سخت متعصبانہ منفی

رویّے سے متاثر ہو کر سر سید نے بنارس کے کلکٹر مسٹر شیکسپیر سے کہا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہندو مسلمان ایک ملک میں متحد ہو کر ایک قوم کی طرح نہیں رہ سکیں گے۔ (حالی نے حیات جاوید میں اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے) لیکن سر سید نے بھی صرف اشارہ کیا ہے۔

بہر حال اقبال برعظیم کی پہلی عظیم شخصیت تھے جنہوں نے مسلم مملکت کے تصور کو ثبت نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا اور ٹھوس دلیلوں کے ذریعہ پیش کیا۔ اس تاریخ ساز خطبہ الہ آباد کے خاص نکتے یہ تھے۔

- اسلام اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کے نظام سیاست کا امتزاج ہے۔ اس نے برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی کو گہرے انداز میں متاثر کیا ہے اور انہیں ایسے بنیادی احساسات، وفاداریاں مہیا کی ہیں جن سے بکھرے ہوئے افراد اور گروہ ایک واضح اور معین قوم کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ایک منفرد اخلاقی شعور کے مالک بن جاتے ہیں۔
- اسلام انسان کی وحدت کو روح اور مادے کی متضاد دوئی میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست باہم مربوط ہیں۔ اسلام کا ذہنی نصب العین بنیادی طور پر اسلام کے معاشرتی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک کو مسترد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا بھی مسترد کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اگر یک قومی بنیادوں پر ایک نظام سیاست کی تشکیل کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اسلامی ملت کی جگہ لے تو یہ بات ایک مسلمان کے لیے ناقابلِ تصور ہے اور یہی وہ معاملہ ہے جو موجودہ وقت میں مسلمانانِ ہند سے براہِ راست تعلق

رکھنا ہے۔

- اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ہندوستانی وطنوں (HOMELANDS) میں اپنی ثقافت اور روایت کے خطوط پر بھرپور اور آزادانہ نشوونما پائیں تو یہ ہندوستان کی آزادی سے لیے سب کچھ بازی پر لگا دینے پر تیار ہوں گے۔
- آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے قومی مطالبات کی تائید کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا: میں ذاتی طور پر ان مطالبات پر یہ اضافہ کروں گا کہ میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست کی صورت میں دیکھنا پسند کروں گا۔ حق خود ارادیت پر مبنی یہ حکومت خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا باہر ایک مضبوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل مجھے کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی آخری منزل دکھائی دیتی ہے۔
- اس سرزمین میں ایک تہذیبی قوت کی حیثیت سے اسلام کی بقا کا دار و مدار اس امر پر ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقے میں مرتکز کر دیا جائے۔ اس لیے میرا مطالبہ ہے کہ ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفادات کے پیش نظر ایک مرکوط مسلم ریاست قائم کر دی جائے اس سے ہندوستان میں طاقت کا اندرونی توازن قائم ہو گا اور امن کو استحکام ملے گا اور اسلام کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے قانون اپنی تعلیم اور تہذیب و ثقافت کو حرکت میں لے آئے اور انہیں اپنی اصل روح اور زمانہ حال کی روح کے قریب لے آئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کیا چاہتے تھے؟ ایک آزاد اور خود مختار اسلامی

مملکت بابرِ عظیم کے سیاسی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے شمال مغربی ہند میں ایک مربوط مسلم ریاست؟

مندرجہ بالا اقتباسات کے تجزیے سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

- اقبال نے جب شمال مغربی ہند میں مسلم اسٹیٹ کے قیام کا مطالبہ کیا تو اسٹیٹ کا لفظ ایک فیڈریشن کے یونٹ کے طور پر استعمال کیا۔
- اقبال جن مسلم وفاقی ریاستوں کو جن کا تصور کر رہے تھے وہ فیڈریشن نہیں کنفیڈریشن تھی کیونکہ اقبال اس کے اجزائے ترکیبی کو آئنی آزادی اور خود مختاری دینے کے قائل تھے کہ ہر ریاست اپنی فوج بھی رکھ سکتی دوسرے برِ عظیم کے دفاع کے لیے ان کے ذہن میں ایک مشترکہ فوج کا تصور بھی تھا تیسرے یہ کہ فیڈریشن کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو خود مختار یونٹ اسے دیں گے۔ وفاقی اسمبلی کے انتخابات براہِ راست نہیں بالواسطہ ہوں گے۔

اس تجزیے کے بعد یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اگر ہندوستانی کنفیڈریشن کے اندر مسلم ریاستیں مطلوب تھیں تو ان کے بارے میں سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر کے الفاظ کیوں لکھے گئے؟ علامہ کی سوچ کے رُخ سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاً وہ چاہتے تو یہی تھے کہ ایک مکمل طور پر آزاد اور خود مختار مملکت وجود میں لائی جائے لیکن اس کا برملا اور غیر مشروط اعلان غالباً اس لیے نہیں کیا کہ مانے ہوتے چوٹی کے مسلم رہنما ابھی جناح کے چودہ نکات کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے اور اس وقت اقبال کا سیاسی قد کاٹھ ایسا نہیں تھا کہ وہ آغا خان محمد علی جناح، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مولانا شوکت علی جیسے رہنماؤں کے متفقہ لائحہ عمل کو چیلنج کرتے۔ بہر حال انہوں نے ایک

انقلابی تصور دے کر پاکستان کی منزل کی طرف واضح طور پر رہنمائی ضرور کر دی۔

حیرت کی بات ہے کہ اقبال کی اس درجہ انقلابی تجویز کا ردعمل خود مسلمانوں میں بظاہر بہت کم ہُوا۔ الہ آباد کی دوازدہ منزل کے ہال میں جہاں یہ خطبہ پیش ہُوا تھا۔ صرف چند سو سامعین تھے۔ اس کے بعد بھی ممتاز مسلم رہنماؤں نے اس پر عمل کر اظہار خیال نہیں کیا۔ صرف چند مسلم اخباروں نے اس کی حمایت میں تھوڑا بہت لکھا مسلم رہنماؤں کا موقف اس کے بعد بھی چودہ نکات کا فلسفہ تھا۔ لیکن اس خطبے نے ہندوؤں اور انگریزوں کو چونکا دیا نہ صرف چونکا دیا بلکہ ان کی سیاسی بیدار مغزی نے انہیں بتا دیا کہ اس تجویز کے مضمرات کیا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہندو اور انگریز پریس نے مشترکہ طور پر اس کے خلاف شدید ترین ردّعمل کا اظہار کیا۔ یہی زمانہ گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کا تھا۔ چنانچہ اس طوفانِ مخالفت کو کم کرنے کے لیے اقبال نے ۱۲، اکتوبر ۱۹۳۱ء کو لندن ٹائمز میں ایک نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے لکھا "میں نے دولتِ برطانیہ سے باہر ایک مسلم ریاست کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ محض ایک قیاس اور خیال تھا۔"

لیکن دوسری گول میز کانفرنس کے انجام اور ہندوؤں کی ہٹ دھرمی نے علامہ کو جلد ہی یقین دلا دیا کہ انہیں معذرتی لب و لہجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انہوں نے لندن میں نیشنل لیگ کے ایک استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے قومی مطالبات کی تائید فرمائی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا اصل حل مسلم ریاست کے قیام میں مضمر ہے۔ انہوں نے فرمایا یہ تجویز مسلمانانِ ہند کے قومی مطالبے میں شامل نہیں لیکن میری ذاتی رائے میں یہی ایک حل ممکن ہے اور میں انتظار کر رہا ہوں کہ تجربے سے اس تجویز کے جواز میں ثبوت مل جائے۔ ۱۵، دسمبر ۱۹۳۲ء

لندن نیشنل لیگ کے استقبالیہ کی ایک تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر علامہ اقبال اور محمد علی جناح کے درمیان ہندوستان کی آئینی صورت حال پر تبادلہ خیال ہوا۔ قیاس کہتا ہے کہ خطبہ الٰہ آباد کی بنیادی تجویز بھی زیر بحث آئی ہوگی۔

گول میز کانفرنس کے مذاکرات سے مختلف اسباب کی بنا پر اقبال اور جناح دونوں مایوس ہوئے اور دونوں سیاسی سرگرمیوں سے کچھ عرصے کے لیے علیحدہ ہو گئے۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۳۴ء سے اقبال کی اس علالت کا آغاز ہوا جس سے وہ آخر تک نجات حاصل نہ کر سکے۔ گلا بیٹھ گیا۔ پھر نقرس نے آن دبایا پھر قلبی ذیق النفس کا عارضہ ہو گیا۔ ان عوارض کی وجہ سے وہ سیاسی تگ و دو میں سرگرمی سے حصہ لینے کے جسمانی طور پر تو قابل نہیں رہتے لیکن ان کے دل و دماغ کی صلاحیتیں سلامت تھیں اور مسلم قومیت کو مستحکم کرنے کے لیے ان کے حوصلے اور ولولے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بہرحال وہ بعض اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لیتے اور سیاسی مسائل پر بیانات بھی جاری کرتے رہے۔ اتنے میں ۱۹۳۶ء کا سال آیا جو برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ ۱۹۳۵ء کے آئین ہند کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات ہونے والے تھے۔ مسلم لیگ کی قیادت محمد علی جناح سنبھال چکے تھے اور مسلم لیگ کی تنظیم کے کام میں مصروف تھے تاکہ انتخابی مہم چلائی جا سکے۔ اسی مقصد کے لیے صوبائی پارلیمانی بورڈ بنانے کے لیے قائد اعظم اپریل ۱۹۳۶ء کے اواخر میں لاہور آئے اور پنجاب کے مقتدر مسلم لیڈروں سے مایوس ہو کر علامہ اقبال سے تعاون کے خواستگار ہوئے علامہ نے اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود قائد اعظم کی آواز پر لبیک کہا۔ پنجاب مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کی صدارت قبول کی۔ اور اپنے رفیقوں کے ساتھ بڑے جوش و خروش کے ساتھ لیگ کی انتخابی مہم کی رہنمائی

کرنے لگے۔ اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ تنظیمی لحاظ سے بہت کمزور تھی۔ مسلم سیاست پر یونینسٹ پارٹی کے سر فضل حسین اور سر سکندر حیات خان اور ان کے حواری چھائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد احرار اور اتحاد ملت کا زور تھا۔ مسلم لیگ کو انتخابات میں شکست تو ہوئی لیکن آیندہ کام کرنے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ اسی زمانے میں کانگریس کے نامور رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن (منعقدہ ۱۹، مارچ ۱۹۳۷ء) میں ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

انہوں نے اپنے خطبہ میں اس امر پر زور دیا کہ :

ہندوستان میں اصل مسئلہ روٹی کا ہے نہ کہ تہذیب کا" مقصد یہ تھا کہ سوشلزم کا نعرہ بلند کر کے غریب مسلم عوام کو اپنی طرف مائل کیا جائے اور مسلم لیگ کی علیحٰدہ قومیت کی تحریک کو نقصان پہنچایا جائے۔ چونکہ امراء پسند مسلم لیگ ابھی تک عام مسلمانوں کے مسائل سے غافل تھی اس لیے اندیشہ تھا کہ روٹی کے نعرہ سے مسلم عوام بنیادی تہذیبی مسئلہ سے غافل ہو جائیں گے۔ مسلم عوام کی غریبی کا مسئلہ بھی اہم مسئلہ تھا۔ اس کا حل بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کو خود ارادیت حاصل ہو۔ اس مرحلہ پر علامہ کی سوچ میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ پہلے مسلم مملکت ء مطالبہ کرتے تھے تو زیادہ تر اسلامی تہذیبی محرکات کی بنا پر۔ اب معاشی محرکات نے بھی اہمیت حاصل کر لی اور انہوں نے قائداعظم کو پاکستان کے راستے پر ڈالنے کے لیے ذاتی اور راز دارانہ خطوط کا سلسلہ شروع کیا۔ ۲۸، مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں صاف صاف لکھا کہ اگر مسلم لیگ کو زندہ رہنا ہے تو اسے ایک عوامی جماعت بننا ہو گا اور اس کا تقاضا ہے کہ مسلم عوام کے افلاس کا مسئلہ حل کیا جائے۔ اقبال نے لکھا کہ خوشی کی بات ہے کہ اس کا حل موجود ہے کہ اسلام کا قانون نافذ کیا جائے اور جدید

تصورات کی روشنی میں اسے مزید نشوونما دی جائے۔ اسلامی قانون کے ایک طویل اور محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے اس کی بنیادی ضروریات مہیا ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور اس کی نشوونما اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ایک یا ایک سے زیادہ مسلمان مملکتیں وجود میں نہیں آجاتیں سالہا سال سے میرا یہ دیانت دارانہ عقیدہ رہا ہے کہ یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے اور پر امن ہندوستان بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں واضح ہے کہ اگر ہندوازم سوشل ڈیماکریسی یا معاشرتی جمہوریت قبول کرتا ہے تو وہ ہندوازم کی حیثیت سے ختم ہو جائے گا لیکن اگر اسلام کسی مناسب صورت میں اور اپنے قانونی اصول کے مطابق معاشرتی جمہوریت قبول کرے تو یہ ایک انقلاب نہیں ہوگا بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہوگا۔ پس جدید مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن اسلامی ہند میں ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی از سر نو تقسیم عمل میں لائی جائے اور قطعی اکثریت کی حامل ایک سے زیادہ مملکتیں وجود میں لائی جائیں۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ ایسا مطالبہ کرنے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ غالباً آپ جواہر لال نہرو کے سوشلزم کا بہترین جواب دے سکتے ہیں۔"

چند دنوں کے بعد ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو اقبال نے قائداعظم کو مزید وضاحت سے لکھا:

"میرے نزدیک واحد ہندوستانی فیڈریشن کا حامل نیا آئین قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اگر ایک پر امن ہندوستان مطلوب ہے اور اگر مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے

کے حق میں وفاداری کے ساتھ ہم اس وقت تک اپنا فرض ادا نہیں کر سکتے جب تک ہم ایک متعین و مخصوص مقصد کے لیے اجتماعی عزم نہ کریں اگر آپ ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں میں اپنا ایک سیاسی وجود قائم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے اس قسم کا بندوبست قطعی ضروری ہے جو سیاسی مصالح ہماری ملی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں وہ پہلے ہی ہماری بدنظمی اور انتشار کے باعث منتشر ہو چکے ہیں۔ گو میں فرقہ وارانہ تصفیہ سے مایوس نہیں ہوں لیکن میں اپنا یہ احساس آپ سے نہیں چھپا سکتا کہ موجودہ بحران کے حل کے لیے ملت کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور آزادانہ سیاسی راہ عمل ایسے نازک وقت میں صرف ان لوگوں کے لیے ہی ممکن ہے جو عزم کے مالک ہوں اور جن کی قوتِ ارادی ایک مقصد پر مرکوز ہو۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ متحدہ عزم کے ذریعے ایک مکمل نامیاتی نظام وضع کریں؟ بے شک یہ ممکن ہے۔ آپ فرقہ بندی اور ہوا و ہوس کی قیود سے آزاد ہو جائیے۔ انفرادی اور اجتماعی عمل کی قدر و قیمت کو پہچانیے خواہ اس مقصد کی روشنی میں جس کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں وہ مادی اغراض ہی سے متعلق نہ ہو۔ مادہ سے گزر کر آپ روحانیت کی طرف جائیے۔ مادہ کثرت ہے، روح نور ہے، زندگی ہے اور وحدت ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے۔ تاریخ کے آڑے وقت میں مسلمانوں کو اسلام نے بچایا ہے مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔

اگر آج آپ اپنی نظریں اسلام پر گاڑ دیں اور اس میں جو حیات آفریں قوت پنہاں ہے اس سے متاثر ہو جائیں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کو پھر سے اکٹھا کر سکیں گے اپنی کھوتی ہوئی صلابتِ کردار دوبارہ حاصل کر لیں گے۔

قرآن کریم کی ایک بڑی معنی خیز آیت یہ ہے کہ پوری انسانیت کی موت اور پیدائش بھی فرد واحد کی موت و پیدائش کی مانند ہے کوئی وجہ نہیں کہ آپ جو انسانیت کے اس ارفع و اعلیٰ تصور کے اولین باعمل شارح ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اسی اصول پر قائم رہیں اور ایک نفس واحد کی طرح قدم آگے بڑھائیں۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

علیکم انفسکم ج لا یضرکم من ضلّ اذا اهتدیتم (۵ - ۱۰۵)

اقبال کے خطوط جناح کے نام

۳۷-۱۹۳۶ء اہم سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے تحت صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات ہونا تھے۔ مسلم لیگ کی قیادت قائد اعظم نے سنبھال لی تھی اور وہ مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مصروف تھے تاکہ اُسے ایک فعال جمہوری جماعت بنایا جا سکے۔ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے صوبوں میں مسلم لیگی پارلیمانی بورڈ بنانے کا مسئلہ درپیش تھا اس مقصد کے لیے قائد اعظم اپریل ۱۹۳۶ء کے اواخر میں لاہور تشریف لے گئے اور پنجاب کے سکہ بند مسلم لیڈروں سر فضل حسین وغیرہ سے مایوس ہو کر علامہ اقبال کے گھر جا کر ان سے ملے۔ متوقع انتخابات کی روشنی میں ان سے پارلیمانی بورڈ بنانے میں امداد کی درخواست کی۔ علامہ اقبال نے اس تجویز کی بھرپور حمایت کی اور مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ چنانچہ ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال کی صدارت میں پنجاب پارلیمانی بورڈ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ بورڈ کی طرف سے ایک اخباری بیان بھی جاری کیا گیا جس میں قائد اعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ جداگانہ انتخاب کے اصول

پر یقین کا اعادہ کیا گیا تھا اور اپیل کی گئی تھی کہ صوبے کی اسمبلی میں خودار اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے اہل امیدواروں کو منتخب کیا جائے۔

اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ ایک غیر منظم اور غیر موثر محدودسی جماعت تھی اصل زور سر فضل حسین اور سر سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی مجلس احرار اور ظفر علی خان کی پارٹی اتحادِ ملت کا تھا۔

علامہ اقبال کی سیاسی فراست نے انہیں بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کو منوانے کی سیاسی جنگ مسلم اکثریتی صوبوں میں لڑی جائے گی اس لیے وہ بے چین تھے کہ رائے عامہ کو جلد سے جلد موثر طریقے سے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کیا جائے۔ اور مسلم قومیت کے مطالبے کو متحدہ سیاسی قوت سے منوایا جائے۔

اس زمانے میں علامہ کی صحت مختلف عوارض سے خاصی خراب ہو چکی تھی آنکھ میں موتیا اترنے کی وجہ سے بمشکل خود لکھ پڑھ سکتے تھے اس کے باوجود اور دوسرے جسمانی عارضوں اور تکلیفوں کے ہوتے ہوتے بھی انہوں نے قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کو منظم کرنے کی کوششوں میں بھرپور حصہ لیا۔ پنجاب پارلیمانی بورڈ کے صدر اور مسلم لیگ کے ایک اہم مدبر کی حیثیت سے وہ مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک قائد اعظم کو کم و بیش مسلسل خطوط لکھتے رہے بلکہ لکھواتے رہے۔

۲۳ مئی ۱۹۳۶ء سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء تک لکھے گئے ان خطوط کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ان کی سیاسی اور تاریخی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ جب ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم نے ان کو شائع کرایا تو اس کا دیباچہ انہوں نے خود لکھا "اس کتابچہ میں وہ خطوط شامل ہیں جو ہمارے فلسفی اور روشن ضمیر قومی شاعر علامہ اقبال نے میرے نام مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء

تک کی درمیانی مدت میں (یعنی اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے تک) تحریر کیے۔ یہ زمانہ وہ انقلابی دور تھا جس میں مسلم لیگ کی تنظیم عمل میں آئی۔ مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈ قائم کیے گئے، انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد ایک نئے اور فیصلہ کن دور میں داخل ہو رہی تھی۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی تنظیم اور پالیسی کی تشکیل میں بھرپور حصہ لیا۔"

آگے چل کر قائداعظم لکھتے ہیں:

یہ خطوط بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً وہ خطوط جن میں انہوں نے مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیالات بنیادی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے۔ ہندوستان جن دستوری مسائل سے دوچار تھا۔ ان کے متعلق ان کے خیالات کے محتاط تجزیئے اور مطالعہ کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا جس کا اظہار قرارداد پاکستان کی شکل میں ہوا۔

ان خطوط میں اقبال نے اس دور کی سیاست کے اہم امور اور مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ خصوصاً پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے مسائل سے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے اجلاس میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا۔ "اصل مسئلہ روٹی کا ہے، تہذیب کا نہیں۔" اس بیان کے مضمرات کا اقبال نے تجزیہ کیا۔ اصل میں ان کا موضوع مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کا مسئلہ تھا۔ اس لیے ان خطوط میں انہوں نے مسلمانانِ ہند کے علیحدہ وجود، مسلمانوں کے اقتصادی اور تہذیبی مسائل کا حل، اسلامی تہذیب کی برتری، اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت، ہندو مسلم فساد اور ان کے

درمیان خانہ جنگی کے خدشات، اسلام، ہندومت اور سوشل جمہوریت کا تعلق مسلمانوں کے حصے کی ملازمتوں پر اونچے طبقے کے لوگوں کا قبضہ، قائداعظم کی ذات سے مسلمانوں کو رہنمائی کی توقعات، نسلی، مذہبی اور لسانی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کی تجویز، فلسطین کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی، مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کی تجویز وغیرہ ایسے اہم اور گوناگوں مسئلوں پر بے باکی اور مدلل طریقے سے لکھا ہے۔

ان خطوط میں علامہ اقبال نے واضح لفظوں میں قائداعظم کی ذہانت قابلیت اور قائدانہ صلاحیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ سیاست کی پرپیچ راہوں میں صرف قائداعظم کی شخصیت ہی مسلمان قوم کی صحیح راہنمائی کر سکتی ہے انہوں نے قائداعظم کو مسلمان قوم کا مسیحا قرار دیا۔ ان خطوط میں وہ قائداعظم کو اپنا ہم نوا بنانے اور قائل کرنے کے لیے ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں۔ وہ قائداعظم کو پاکستان کے مطالبے کی طرف لاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

خطوط کے اقتباسات

مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک علامہ اقبال نے قائداعظم کو تیرہ خطوط لکھے۔ ان کے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

"اگرچہ ہم ملک میں تمام ترقی پسند پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تاہم ہمیں اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ،

ایشیا میں اسلام کے اخلاقی وسیاسی اقتدار کا تمام تر دارومدار ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے لہٰذا میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو پرزور جواب دیا جائے (جس میں جواہر لال نہرو نے کہا ہے۔ ہندوستان میں اصل مسئلہ روٹی کا ہے نہ کہ تہذیب کا) آپ کو چاہیے کہ دہلی میں جلد از جلد ایک آل انڈیا کنونشن منعقد کریں جس میں نئی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم رہنماؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ آپ کو چاہیے کہ اس اسلامی کنونشن کی طرف سے پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی وحدت کا بطور نصب العین اعلان کر دیں۔ یہ امر لازمی ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دنیا کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ ہندوستان میں حل طلب مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ہندی مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا مستقبل، اگر معاشی مسئلہ سے زیادہ اہم نہیں تو اس سے کسی طرح کم اہمیت کا حامل بھی نہیں۔

اگر آپ ایسی کنونشن منعقد کر سکیں تو ان مسلم ارکان مجالس قانون ساز کی حیثیت کا پول بھی کھل جائے گا۔ جنہوں نے مسلمانوں کی خواہش اور تمناؤں کے خلاف اپنی علیحدہ علیحدہ پارٹیاں قائم کر لی ہیں۔ مزید براں اس اجتماع سے ہندوؤں پر بھی عیاں ہو جائے گا کہ کوئی تدبیر خواہ وہ کتنی ہی عیارانہ ہو۔ ہندی مسلمانوں کو اپنی تہذیبی وقعت سے غافل نہیں کر سکتی۔ (۳۰، مارچ ۱۹۳۷ء)

مجھے یقین کامل ہے کہ اسلامی ہند کی نزاکت حالات کا آپ کو پورا پورا احساس ہے (مسلم) لیگ کو انجام کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندہ

بنی رہیے یا مسلم عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرے۔ جنہیں اب تک نہایت بجا طور پر لیگ میں کوئی وجہ دلکشی نظر نہیں آتی میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو عام مسلمانوں کی بہبودی کی ضامن نہ ہو عوام کے لیے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔

نئے دستور کے مطابق بڑی بڑی آسامیاں تو اعلیٰ طبقات کے بچوں کے لیے وقف ہیں اور چھوٹی چھوٹی وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اعتبارات سے بھی ہمارے سیاسی اداروں نے غریب مسلمان کی اصلاح احوال کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی۔

روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری اور سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے اگرچہ ابھی قوی نہیں ہوا لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت و شدت حاصل کر کے رہے گا۔

جواہر لعل نہرو کی منکرِ خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیوں کر نجات دلائی جا سکتی ہے؟

لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے لاتعلق ہی رہیں گے۔

خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے فقہ اسلامی کا

مطالعہ زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کی روشنی میں دوسرے مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے۔

اگر اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا ایسی چند ریاستوں کی عدم موجودگی میں اسلامی شریعت کا نفاذ اس ملک میں محال ہے سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میں اسے (آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو) ہی مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔

جواہر لعل نہرو کی اشتراکیت خود ہندوؤں میں کشت و خون کا موجب ہو گی معاشرتی جمہوریت (سوشل ڈیماکریسی) اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع، برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہو گا یا نہیں۔ میں اس سے متعلق تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ ہندو دھرم معاشرتی جمہوریت اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم کا خاتمہ یقینی ہے۔

اسلام کے لیے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید موافقت حاصل ہو۔ حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہو گا۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا اوپر ذکر کر چکا ہوں، اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔ کیا آپ کی رائے میں ابھی اس مطالبہ کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لال نہرو کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔

بہر حال میں نے اپنے خیالات آپ کی خدمت میں اس اُمید میں پیش کر دیئے ہیں کہ آپ ان پر اپنے خطبہ لیگ کے آئندہ اجلاس کی مباحث میں پوری پوری توجہ مبذول کر سکیں۔
اسلامی ہندوستان کو اُمید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی ذہانت اور فراست ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔ (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

"اس وقت مسلمانوں کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشہ گوشہ سے اُٹھنے والا ہے، صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔
صورت حال کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سکھوں اور ہندو مسلمانوں میں خانہ جنگی کی سی صورت حال کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ معاشی بلکہ خالص سیاسی ہیں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں ہندو اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف وہراس طاری کرنا ہے۔ آئین کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دارومدار تمام تر غیر مسلموں پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ صرف مناسب کارروائی نہیں کر سکتی بلکہ وزارت کو خود مسلمانوں سے ناانصافی کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ لوگ جن کی امداد پر وزارت قائم ہے خوش رہ سکیں، اور دوسروں پر ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر متعصب ہے۔ مجھے اس امر میں قطعاً ذرہ برابر شک وشبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ موجودہ دستور ہندی مسلمانوں کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔
مزید برآں، یہ دستور تو اس معاشی تنگدستی کا جو شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے، کوئی علاج ہی نہیں۔ فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو اور نہ کر سکے اس کے لیے بے سود ہے۔

ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اس طریق پر جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق میں، اسلامی اصلاحات کا نفاذ ہے۔

شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہند اور بیرون ہند کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری سے کیوں کر محروم کیا جا سکتا ہے۔!

ہندوستان میں امن نسلی، مذہبی اور لسانی میلانات کی بنا پر ملک کی تقسیم مکرّر پر موقوف ہے۔ اکثر برطانوی مدبر بھی اس "نظریئے" کے قائل ہیں۔ مجھے یاد ہے انگلستان سے میری روانگی کے وقت لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا:

ہندوستان کی مشکلات کا حل تو تمہاری سکیم میں موجود ہے۔ لیکن اس کے بار ور ہونے کے لیے پچیس سال کی مدت درکار ہو گی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبے میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے۔ جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار مجبوراً اختیار کرنا ہی پڑے گا۔ (۲۱ جون ۱۹۳۷ء)

حالات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ لیگ کو اپنی تمام تر توجہ "شمال مغربی ہندوستان" کے مسلمانوں پر مبذول کرنی چاہیئے" ۔۔۔۔۔۔۔ (۱۱ اگست ۱۹۳۷ء)

ہندوستانی مسلمان آپ سے متوقع ہیں کہ اس پر آشوب زمانے میں آپ ان کے مستقبل سے متعلق ان کی کامل اور واضح ترین رہنمائی فرمائیں ۔۔۔۔۔۔

میری تجویز ہے کہ لیگ کمیونل اوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) سے متعلق اپنی پالیسی ایک مناسب قرارداد کی صورت میں واضح کر دے ۔۔۔۔۔

مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے لیگ کے مقاصد کے لیے مسلمان

عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لیے نادر موقع ہے مجھے اُمید ہے کہ لیگ اس مسئلہ پر ایک مناسب قرارداد ہی منظور نہیں کرے گی بلکہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسی راہ عمل بھی معین کی جائے گی جس میں مسلمان عوام بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔ اس طریق سے ایک طرف تو لیگ کو ہر دل عزیزی حاصل ہو گی اور دوسری طرف شاید فلسطین کے عربوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔

ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا مسلط کیا جانا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے پُر خطر ہے"۔

(۷۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

قائدِ اعظم اقبال کی نظر میں

۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ لندن کے جلسہ میں اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے مطالبہ کو ایک واضح سیاسی نصب العین کے طور پر پیش کیا اس جلسہ کی ایک تاریخی اہمیت یہ تھی کہ اسی موقعہ پر قائد اعظم سے اقبال کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ قیاس کہتا ہے خطبہ الٰہ آباد ضرور زیر بحث آیا ہوگا۔ گول میز کانفرنسوں کی ناکامی کے پس منظر میں یہ ملاقات بہت اہمیت رکھتی ہے اس لیے اور بھی کہ اس وقت تک خود قائد اعظم بھی ہندوؤں کے متعصبانہ رویئے سے بیزار ہو چکے تھے۔ قائد اعظم سے اقبال کی سیاسی رسم و راہ تو ۱۹۲۷ء کے سائمن کمیشن کے وقت سے تھی۔ جس میں اُنہیں ان کی شخصیت و

کردار کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہوگا۔ لیکن نیشنل لیگ کے استقبالیہ کی ملاقات کے دقت سے دونوں کے سیاسی نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہونے لگی تھی اور ایک دوسرے کی سیاسی قدر و قیمت کا اندازہ بھی دونوں کو ہونے لگا تھا اس کا ثبوت وہ تاریخی جملہ ہے۔ جو انہوں نے اپریل ۱۹۳۶ء کے اواخر میں قائداعظم سے کہا جب وہ پنجاب میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کرنے میں ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے بہ نفس نفیس جاوید منزل میں تشریف لائے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ پہلے قائداعظم پنجاب کے مقتدر لیڈر میاں سر فضل حسین سے ملاقات کر چکے تھے۔ جنہوں نے نہ صرف مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کرنے میں ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ بڑی بے رخی سے پیش آئے تھے۔ بلکہ یہاں تک کہا تھا: آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں آپ پنجاب سے چلے جائیے"۔ اس پس منظر میں اقبال نے قائداعظم سے کہا:

میں آپ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنی رگوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑنے کو تیار ہوں۔" اور یہ محض زبانی دعویٰ نہ تھا جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ہر چند کہ وہ مختلف عوارض کا شکار تھے۔ موتیا بند اترنے کی وجہ سے بینائی تک تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ آسانی سے خود لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک قائداعظم کو انتہائی اہم تاریخی خطوط لکھے اور قائداعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کیا بلکہ انہیں مسلمانوں کا مسیحا قرار دیا۔

۲۰ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

اسلامی ہند کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی ذہانت اور فراست ہماری موجودہ مشکلات کا حل تجویز کر سکے گی"۔ ۲۰ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں علامہ نے قائداعظم کو لکھا:

"اس وقت مسلمانوں کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشہ گوشہ سے اُٹھنے والا ہے صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے"۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے خط میں یہی خیال پھر دہرایا:

ہندوستانی مسلمان آپ سے متوقع ہیں کہ اس پر آشوب زمانے میں آپ ان کے مستقبل سے متعلق ان کی کامل اور واضح ترین رہنمائی فرمائیں۔

یہ جو کچھ اُنھوں نے قائداعظم کو ذاتی خطوط میں لکھا یہ ان کی سوچی سمجھی رائے تھی اس کی تائید اس مکالمے سے ہوتی ہے جو پاکستان ٹائمز۔ لاہور کی ۱۴ اگست ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں بادشاہ حسین کے قلم سے چھپا ہے۔ بادشاہ حسین نے علامہ کی وفات سے تقریباً ۲ سال قبل علامہ سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں ان کی علامہ سے اس زمانے کی سیاسی صورتِ حال کی روشنی میں، قائداعظم کے بارے میں جو گفتگو ہوئی تھی۔ اسے بادشاہ حسین نے ایک مکالمہ کی شکل میں نقل کیا ہے۔ اس مکالمے کا ایک اقتباس یہ ہے:

بادشاہ حسین۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا صحیح رہنما ہے جو مسلمان مجاہدوں کی قوت کو منزلِ مقصود حاصل کرنے کے لیے استعمال کر سکے آپ کے خیال میں کیا مسٹر جناح وہ تاریخ ساز شخصیت ہیں۔

علامہ۔

جی ہاں۔ میری بصیرت کہتی ہے کہ مسٹر جناح ملتِ اسلامیہ کو منزلِ مقصود تک پہنچائیں گے۔

بادشاہ حسین۔ کیا آپ نے انہیں بالکل قریب سے دیکھا ہے؟

علامہ۔

ہم نے اکثر تقریباً اہم مسائل پر خط و کتابت کے ذریعے عملاً گفتگو کی ہے ہم نے ملاقاتوں کے ذریعہ بھی تفصیل سے باہم تبادلہ خیالات کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس مشکل کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔"

بادشاہ حسین۔ لیکن شاید عوام میں انہیں مقبولیت حاصل نہیں۔

علامہ۔ یہ میری پیشین گوئی ہے کہ مسٹر جناح ایسے کردار اخلاق، فہم و تدبر اور عزم محکم کے مالک ہیں جن کی بنا پر وہ جلد ہی ایک ایسے عوامی ہیرو بن جائیں گے کہ مسلم ہندوستان میں ابھی تک اس قسم کا کوئی لیڈر پیدا نہیں ہوا۔

مسٹر جناح برطانوی استعمار اور نوکر شاہی کی اصلیت سے بخوبی واقف ہیں اور وہ کانگرس کی ذہنیت کے بھی بھیدی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکتے اور ان کو شکست دے سکتے ہیں۔"

قائداعظم پر اس تبصرہ سے خود اقبال کی سیاسی بصیرت کی بھی داد دینی پڑتی ہے اس لیے کہ اس وقت تک وہ نسبتاً کم معروف سیاسی رہنما تھے۔ عوام میں تو ان کا چرچا بہت ہی کم تھا۔ لیکن اس مرد خود آگاہ و خدا مست نے دیکھ لیا تھا کہ اس بھنور میں مسلمانوں کی کشتی کا کھیون ہار کون ہو سکتا ہے۔

قائداعظم سے علامہ کی غیر مشروط عقیدت کا اظہار اس جواب سے بھی ہوتا ہے کہ جو انہوں نے جواہر لال نہرو کو دیا تھا۔ فروری ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو پنجاب کے مشہور سیاسی راہنما میاں افتخار الدین (جو اس وقت کانگرس میں تھے)

کے ساتھ جاوید منزل میں علامہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے۔ شام کا وقت تھا علامہ حسب دستور بنیان اور دھوتی میں ملبوس بستر پر نیم دراز تھے۔ کمرہ میں دو چار کرسیاں موجود تھیں۔ لیکن نہرو التزاماً علامہ کے پلنگ کے پاس قالین پر بیٹھے۔ اور بڑی لچھے دار گفتگو شروع کی۔ میاں افتخارالدین نے موقع محل دیکھ کر گرہ لگائی "مسلمانوں کے اصل لیڈر تو آپ ہیں۔ عام مسلمان آپ ہی کو مانتے ہیں" ساتھ ہی دو ایک فقرے ایسے بھی کہے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ محمد علی جناح کیا ہیں۔ اصل میں تو آپ ہی آپ ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہندو مسلمانوں میں مفاہمت ہو سکتی ہے"۔ علامہ تاڑ گئے کہ ان چکنی چپڑی باتوں اور نیاز مندی کا اصل منشا کیا ہے وہ غصہ اور جوش سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے چہرہ سرخ ہو گیا اور قدرے بلند آواز سے کہا۔

"میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصل قائد مسٹر جناح ہی ہیں میں تو ان کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں"۔ یہ فروری ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے اس کے چند ماہ بعد علامہ کا انتقال ہو گیا۔

اقبال قائدِ اعظم کی نظر میں

ایک بڑے آدمی، کی بڑائی کا صحیح اندازہ بھی ایک بڑا آدمی ہی کر سکتا ہے۔ اقبال اور محمد علی جناح ایسے بلند نگاہ اور عالی ظرف، دو بڑے آدمی تھے۔ جنہوں نے ایک دوسرے کی عظمت کا اعتراف برملا کیا اور ایک نے دوسرے کی سیادت و قیادت قبول کرنے میں فخر کا اظہار کیا۔ اقبال کے دل میں قائدِ اعظم کا کتنا احترام تھا اس کا اندازہ اس جواب

سے ہوتا ہے جو انہوں نے کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے میاں افتخار الدین کو دیا تھا۔ آپ نے پُرجوش الفاظ میں فرمایا:

"مَیں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں میں تو ان کا معمولی سپاہی ہُوں"۔

اقبال نے مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک قائداعظم کو مسلم لیگ کی تنظیم نو اور ہندوستان کے شمال مغرب میں آزاد مسلم ریاست (پاکستان) کے قیام کی راہ ہموار کرنے کے لیے جو خطوط لکھے ان کی سیاسی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ بڑی حد تک ان ہی مراسلات کی روشنی میں قائداعظم نے مسلم لیگ کو منظم کیا۔ اس کے لائحہ عمل میں ضروری تبدیلیاں کیں اور بتدریج قرار داد پاکستان کو اپنا مسلک قرار دیا۔ اور خود اقبال نے قائداعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ انہیں ہندی مسلمانوں کا نجات دہندہ کہا اور تقریباً ہر خط میں اپنے اس یقین کو دُہرایا کہ ان حالات میں وہی مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا سکتے ہیں۔

قائداعظم بھی ان کی رفاقت اور سیاسی مشوروں کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔

"آج اقبال ہم میں موجود نہیں اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتے کہ ہم نے وہی کچھ کیا ہے جس کی انہیں ہم سے توقع تھی"۔

اقبال کے "خطوط جناح کے نام" کے دیباچے میں قائداعظم نے لکھا:

"ان کے اور میرے خیالات میں ہم آہنگی اور یگانگت تھی اور ہندوستان کے آئینی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے بعد میں بھی انہی نتائج پر پہنچا ان کے افکار و خیالات نے

ہندوستان کے مسلمانوں کے عزم کی صورت اختیار کرلی اور اس کا مظہر آل انڈیا مسلم لیگ اور قرارداد لاہور ہے جسے قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کی وفات پر قائدِ اعظم نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا:

"میرے لیے وہ ایک رہنما تھے دوست اور فلسفی اور تاریک ترین لمحوں میں جن سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا وہ چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوئے"۔

۱۹۴۰ء میں یوم اقبال کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اقبال کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا۔

اقبال میرے پرانے دوست تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتدا میں ایک قسم کی علمی (ACADEMIC ORGANISATION) جماعت تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہم نے محسوس کیا کہ اس جماعت کو صحیح عوامی جماعت میں بدلنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ جب میں اپریل ۱۹۳۶ء میں پنجاب آیا تو سب سے پہلے میں اقبال سے ملا میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے رکھے انہوں نے فوراً مجھ سے اتفاق کیا اس وقت سے تادمِ آخر وہ میرے ساتھ چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ اقبال بہت بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات انجام دیں"۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں یوم اقبال کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

اقبال کی ادبی شہرت عالمگیر ہے وہ مشرق کے بہت بڑے ادیب، بلند پایہ شاعر اور جلیل القدر مفکر تھے۔ لیکن اس حقیقت کو میں سمجھتا ہوں کہ اقبال دنیا کے بہت بڑے سیاست دان اور مدبر تھے۔ انہوں نے آپ کے سامنے ایک واضح اور صحیح راستہ رکھ دیا

باب چہارم

افکار و خیالات

تصانیفِ اقبال

- فکرِ اقبال کے جواہر ریزے
- کامیاب زندگی کا تصور کلامِ اقبال میں
- اقبال کے تعلیمی تصورات

اقبال کی تصانیف

علامہ اقبال کی سب سے پہلی کتاب معاشیات پر ہے جو علم الاقتصاد کے نام سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی کتاب کا دیباچہ اقبال نے خود لکھا اس کتاب کو لکھنے کے پیچھے یہ احساس کارفرما تھا کہ جس قوم میں اقتصادی اصولوں کی جتنی واقفیت ہوگی اتنی ہی وہ قوم خوش حال ہوگی۔ اقبال کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ نے دی تھی اور اس کی زبان و بیان کی کچھ اصلاح مولانا شبلی نعمانی نے کی تھی۔ کتاب کو پانچ حصوں میں اور بیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں معاشیات کے موضوع کی اہمیت اور دولت کی تعریف سے بحث ہے۔ باقی چار حصوں میں معاشیات کے چار بنیادی شعبوں سے بحث کی گئی ہے جو دولت کے ذیل میں آتے ہیں کتاب کا مرکزی خیال یہ سوال ہے کہ جدید علم معاشیات ہندوستان کے معاشی مسائل حل کرنے میں کہاں تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ کتاب کا نمونہ یہ ہے:

بے قید معیشت یا سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حکما کا ایک طبقہ جس کو حکمائے متوکلین کے نام سے موسوم کرنا چاہیے لکھتا ہے کہ موجودہ نظام معیشت میں قوانین کی مدد سے کوئی دست اندازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کو تمام قانونی اور دیگر قیود سے آزاد کر کے اس بات پر اعتماد کرنا چاہیے کہ بالآخر جو کچھ ہوگا نوعِ انسانی

کے لیے اچھا ہوگا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی آزادی قیود کو دُور کرنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ قیود ایسے ہوتے ہیں جن سے آزادی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوجاتا ہے'

فلسفۂ عجم

" ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" فلسفۂ ایران پر یہ مقالہ علامہ نے ۱۹۰۸ء میں میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے انگریزی میں لکھا تھا۔ اس کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

اسرارِ خودی

فارسی کی یہ فلسفیانہ مثنوی ۱۹۱۵ء میں شائع ہُوئی اسے انہوں نے اپنے والد شیخ نور محمد کے ایما، پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اقبال کا مشہورِ زمانہ فلسفۂ خُودی مربوط انداز میں اسی مثنوی میں پیش کیا گیا اسی مثنوی کے چند عنوانات یہ ہیں ،

نظامِ عالم کی اصل خودی سے ہے۔ تعیناتِ وجود کے تسلسل کا انحصار زندگی کے استحکامِ خُودی پر ہے۔ خودی کی زندگی مقاصد کی تخلیق و تولید سے ہے خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے خُودی سوال سے کمزور ہوجاتی ہے۔ جب خودی عشق سے مستحکم ہوجاتی ہے تو نظامِ عالم کے ظاہر و مخفی قوی کو مسخر کرلیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس ضمن میں افلاطون کے خیالات و عجمی تصوف کے مضر اثرات کا تذکرہ ہے۔

تربیت خُودی کی تین مرحلوں کا بیان ہے۔ پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا ضبط نفس اور تیسرا نیابتِ الٰہی۔ آخر میں کچھ حکایات کے ذریعہ خُودی کے مرحلوں کی توضیح کی ہے۔

۱۹۲۰ء میں اقبال کی اجازت سے انگلستان کے پروفیسر نکلسن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ سے اقبال کی شہرت بحیثیت فلسفی شاعر تمام مغربی دُنیا میں ہوئی جب پروفیسر نکلسن اقبال کو ترجمے کی اجازت لینے کے لیے ملا تو ایک روایت کے مطابق اقبال رو پڑے۔ پُوچھنے پر فرمایا:

"میرے عوام جن کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی نہ اس کی قدر و قیمت پہنچانتے ہیں اور نہ اسے کوئی بڑا کام سمجھتے ہیں لیکن یورپ جس کے لیے میں نے یہ کتاب نہیں لکھی میرا پیغام سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں خودی کے مفہوم کی وضاحت کے لیے اقبال نے خود ایک دیباچہ لکھا تھا دوسرے ایڈیشنوں میں یہ دیباچہ اور خواجہ حافظ پر تنقید سے متعلق اشعار حذف کر دیئے گئے۔

رموزِ بے خودی

یہ ایک لحاظ سے مثنوی اسرار کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ رموز کے بعض عنوانات یہ ہیں: فرد و ملت کے رابطہ کے بارے میں۔ اختلاطِ افراد سے ملت بنتی ہے۔ اور ملت کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان اول توحید دوم رسالت۔ اس معنی میں کہ ملت کی اساس وطن نہیں ہے۔ اس معنی میں کہ ملت محمدی کا آئین قرآن ہے۔ اس معنی میں کہ ملت کا حسن سیرت و اتباع سنت محمدیؐ میں ہے" وغیرہ۔ رموزِ بے خودی میں افراد کو اپنی خودی مٹا دینے کا درس نہیں دیا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ افراد کو اپنی خودی کی تکمیل کے بعد ملت کے وسیع تر استحکام کے لیے اپنی خودی کو ملت کی خودی میں ضم کر

دینا چاہیے بلکہ خودی کی تکمیل ہی بے خودی میں ہوتی ہے۔ رموزِ بے خودی کا ترجمہ انگریزی میں سب سے پہلے پروفیسر آربری نے کیا۔ اب ان دونوں مثنویوں کو ملا کر اسرار و رموز کے نام سے یکجا کر دیا ہے۔ اسرار و رموز کا ترجمہ عربی و ترکی میں بھی ہو چکا ہے۔

پیامِ مشرق

فارسی شاعری کی یہ کتاب ۲۳-۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اس کا دیباچہ بھی اقبال نے خود لکھا پیامِ مشرق، جرمن شاعر گوئٹے کی کتاب پیامِ مغرب کے جواب میں لکھی گئی۔ گوئٹے نے مشرقی ادب کا بالخصوص مولانا روم کا مطالعہ کیا تھا ان سے مستفید بھی ہوا لیکن ان کے فلسفہ کے بہت سے حصوں سے اتفاق نہیں کیا اور پیامِ مغرب کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مغرب ہی دُنیا کے مسائل حل کرنے میں رہبری کر سکتا ہے اس کے جواب میں علامہ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جس علم سے آج مغرب استفادہ کر رہا ہے وہ مشرق کا خصوصاً مسلمانوں کا ورثہ ہے پیامِ مشرق میں وہ معارف بیان کیے گئے ہیں جو افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں اس کے علاوہ اس کتاب میں قوموں کے زوال و فرنگی سیاست حاضرہ کی فریب کاری یورپ میں انسانیت کی خواری کے ذکر کے ساتھ ساتھ تسخیرِ فطرت، میلادِ آدم، افکارِ ابلیس۔ آدم کا جنت سے نکالے جانے کا منظر، قیامت کا قصہ فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بہار کی آمد اور کشمیر کی تصویر کشی ہے اور مغربی فلسفیوں کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ باعزت اور کامیاب زندگی کے اصولوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ پیامِ مشرق کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

بانگِ درا

علامہ کا یہ پہلا اُردو شعری مجموعہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں شیخ عبدالقادر کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہُوا۔ اس میں ابتداء سے ۱۹۲۳ء تک کا اُردو کلام تین حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ ابتداء سے ۱۹۰۵ء تک دوسرا ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک قیام یورپ کے زمانے کا تیسرا حصہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک۔ اس مجموعہ کو ترتیب دیتے ہوئے علامہ نے اپنے کلام میں کافی کانٹ چھانٹ کی۔ بانگ درا کے آخر میں علامہ کے ظریفانہ کلام کا ایک حصہ بھی ہے یہ علامہ کی مقبول ترین کتاب ہے۔ ترانۂ ہندی، ترانۂ ملی، شکوہ، جواب شکوہ، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، اس مجموعہ کی چند مشہور نظمیں ہیں۔

زبورِ عجم

فارسی کلام کی یہ کتاب جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصے میں غزلیں ہیں جن کی تعداد ۷۷ ہے ان غزلوں میں غزل کے روایتی الفاظ عاشق، معشوق، شراب صراحی، رخسار بالکل نئے روحانی معنوں میں استعمال ہُوتے ہیں۔ عام فضا مایوسی کی نہیں امنگ اور اُمید کی ہے۔ زبورِ عجم کا دوسرا باب، گلشن راز جدید کے نام سے ایک مثنوی ہے۔ یہ مثنوی علامہ نے تصوف کے موضوع پر شیخ محمود شبستری کی مشہور تصنیف گلشن راز کے جواب میں لکھی تھی۔ اس کتاب کا تیسرا حصہ بندگی نامہ ہے جس میں انہوں نے غلامی کے بداثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے اور آزادی کے لیے ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی حوالے سے آزاد اور غلام قوموں کے فنِ تعمیر اور دیگر فنونِ لطیفہ

پر تبصرہ کیا ہے جو فنونِ لطیفہ کو جاننے کی ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے۔

جاوید نامہ

علامہ نے مشہور اطالوی شاعر دانتے کی کتاب طربیہ خداوندی (ڈوائن کیمڈی) کے جواب میں ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ شائع کیا اصل میں یہ معراج نامہ ہے جس میں تخیل کے پروں سے افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ اس سیر کے دوران ان کی ملاقات کئی مسلم اور غیر مسلم مشاہیر سے ہوتی ہے۔ مسلم مشاہیر کے ساتھ غیر مسلم مشاہیر کا ذکر علامہ کی وسعتِ قلب پر دلالت کرتا ہے۔ اسی میں علم عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کا ذکر بھی ہے۔ کشمیر جنت نظیر کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا بیان بھی ہے۔ اسی کتاب کے آخر میں خطاب بہ جاوید وہ قطعہ ہے جو علامہ نے اپنے بیٹے جاوید کو مخاطب کر کے لکھا:

"جاوید نامہ، علامہ اقبال کی نہایت اہم فارسی تصنیف ہے فکر و فن۔ دونوں کے اعتبار سے۔ اس کا ترکی اور جرمن میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

بالِ جبریل

علامہ کا دوسرا مشہور و مقبول اردو مجموعہ کلام ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اس میں ۱۹۲۴ء سے بعد کا کلام ہے اس کی غزلوں اور نظموں میں فکر کے ساتھ ساتھ تغزل درجہ کمال پر ہے۔ مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، طارق کی دعا، مکالمہ جبرئیل و ابلیس وغیرہ۔ ایسی لافانی نظمیں اس مجموعے کی زینت ہیں۔ یہ علامہ کی نمائندہ کتاب ہے کہتے ہیں پہلے اس کا نام نشانِ

تجویز ہُوا تھا۔

مثنوی مسافر

۱۹۳۳ء میں علامہ نے سید سلیمان ندوی اور سر سید راس مسعود کے ساتھ شاہ افغانستان نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا تعلیمی دورہ کیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اس سفر کے تاثرات ایک فارسی مثنوی میں مسافر کے نام سے شائع کیئے۔

ضربِ کلیم

علامہ کا تیسرا اُردو مجموعہ جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہُوا پہلے اس کا نام صورِ اسرافیل تجویز ہوا تھا لیکن بعد کو ضربِ کلیم سے بدل دیا گیا جو زیادہ معنی خیز ہے یہ کتاب اعلانِ جنگ ہے۔ زمانہ حاضر کے خلاف اور خُودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اس کی بعض نظمیں اور غزلیں جیسے شاعِ اُمید، زمانہ حاضرہ کا انسان، خودی کا سرِّ نہاں، فنونِ لطیفہ، سلطان ٹیپو کی وصیت وغیرہ بالِ جبریل کا سا جمال و کمال رکھتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس مجموعہ پہ فکر کا عنصر غالب ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

یہ فارسی مثنوی ۱۹۳۶ء میں ضربِ کلیم کی اشاعت کے فوراً بعد شائع ہُوئی اس مثنوی کی شانِ نزول یہ بیان کی جاتی ہے کہ ۱۳، اپریل ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال بھوپال کے شیش محل میں سوئے ہُوئے تھے کہ رات کے تین بجے سر سید نے ان سے خواب میں پوچھا:

"تم کب سے بیمار ہو"

جواب دیا " دو سال سے بیمار ہُوں". سر سید نے فرمایا حضور رسالتمآب کے حضور میں التجا کیوں نہیں کرتے، اس پر ان کی آنکھ کھل گئی اور اُنہوں نے عرض داشت کے طور پر چند اشعار کہے جو بعد کو مثنوی کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ کتاب اَب مثنوی کے ساتھ شائع ہوئی ہے لیکن یہ صرف نعت اور عرض حال بحضور رسول مقبول ہی نہیں اصل میں یہ جائزہ اور تبصرہ ہے اس دور کے ہند اور بیرون ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث و واقعات پر۔

ارمغانِ حجاز

یہ علامہ کی آخری کتاب ہے اس میں ضرب کلیم کے بعد کا اُردو اور فارسی کلام جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ علامہ کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ حج کرنا اور حضور صلعم کے روضۂ پاک پر حاضری دینا اقبال کی دیرینہ قلبی خواہش تھی یہی جذبہ اس کی بعض نظموں کا محرک ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ حج کے دوران روضہ مبارک پر کھڑے ہو کر اس ارمغانِ حجاز کو خود پیش کریں۔ لیکن افسوس کہ قضا نے انہیں اس سعادت سے محروم رکھا اس کتاب میں علامہ کے بنیادی خیالات و افکار بہتر شکل میں ملتے ہیں۔

ارمغانِ حجاز کا ایک حصہ اردو میں اور ایک فارسی میں ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ اور بڈھے بلوچ کی نصیحت جیسی نادر نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اس کی بعض رباعیاں علامہ کی توحید پرستی کا بہترین شعری اظہار ہیں۔ مدینے کی زیارت کا شوق اشعار سے پھوٹا پڑتا ہے۔

نثری مجموعے

شذراتِ اقبال

یہ ذاتی ڈائری کے اوراق ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے آنے کے بعد علامہ چند سال تک ذہنی اور جذباتی طور پر بہت مضطرب رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے اشعار بہت کم لکھے لیکن ذاتی یادداشتوں پر مبنی ایک ڈائری لکھنی شروع کر دی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کو پہلا اندراج ہے۔ علامہ نے انگریزی میں لکھی ہوئی اس ڈائری کے سرورق خود ہی (STRAY REFLECTIONS) یا افکار پریشاں کا عنوان درج کیا تھا۔ اصل میں اس میں ذاتی زندگی کے واقعات و حادثات کا بیان نہیں۔ ذہنی تاثرات و افکار کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس کو مرتب کر کے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ بعد کو اس کا ترجمہ شذراتِ اقبال کے نام سے چھپا۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامی

یہ علامہ اقبال کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو علامہ نے مدراس اور علی گڑھ میں ۱۹۲۹ء میں دیتے تھے۔ اصل کتاب انگریزی میں (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے نام سے علامہ کی زندگی ہی میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوتی۔ اس کا اقبال کا نظر ثانی شدہ ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ فلسفۂ مذہب اور اسلام پر یہ کتاب علامہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ فکر و فلسفۂ اقبال کے مطالعہ

کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مقالاتِ اقبال اور مضامینِ اقبال

علامہ نے مختلف رسائل کے لیے بے شمار موضوعات پر اُردو انگریزی میں مضامین لکھے ان کو اکٹھا کر کے سید عبدالوحد معینی نے مقالاتِ اقبال کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے: انوارِ اقبال اور اقبال کے خطوط اور تحریروں کے یہ دو مجموعے ۱۹۶۷ء ڈاکٹر بشیر احمد ڈار نے مرتب کر کے شائع کیے۔

تقاریر اور بیانات کے انگریزی مجموعے

پہلا مجموعہ SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL
شملو نے ۱۹۴۵ء میں شائع کیا دوسرا مجموعہ
عبدالواحد معینی نے ترتیب دیا۔ THOUGHTS AND WRITINGS OF IQBAL
تیسرا مجموعہ اقبال کے خطوط اور تحریریں۔
ڈاکٹر بشیر احمد ڈار نے مرتب کیا ہے۔ LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL

گفتارِ اقبال

زمیندار اور انقلاب اخبار کی جلدوں سے اخذ کیا ہوا اقبال کی تقریروں اور بیانات کا مجموعہ ہے۔ جسے محمد رفیق افضل نے مدون کیا ہے۔
انوارِ اقبال، حرفِ اقبال، اقبالنامہ حصہ اوّل و دوم، مکاتیبِ اقبال، مکتوباتِ اقبال،

ثہ دادِ اقبال اُ . د خطوط کے مجموعے ہیں ۔

اقبال کے خطوط جناح کے نام

IQBAL'S LETTERS TO JINHAH

قائدِاعظم کے نام اقبال کے انگریزی خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۴۳ء میں قائدِاعظم کے دیباچے کے ساتھ شائع ہُوا ۔

غیر مدّون کلام

اقبال نے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم ترتیب دیتے وقت کچھ کلام یا تو مسترد کر دیا تھا یا ترمیم کے بعد شامل کیا تھا ۔ بعض چیزیں بکھری پڑی تھیں ۔ ان کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں ۔

رختِ سفر

باقیاتِ اقبال

سرودِ رفتہ

کچھ غیر مطبوعہ کلام " روزگارِ فقیر " اور اقبال از عطیہ بیگم میں بھی ہے (ان کتابوں میں خاصا مواد مشترک بھی ہے)

درسی کتابیں

اقبال نے وقتاً فوقتاً بعض اُردو فارسی درسی کتابیں بھی بعض دوسرے مصنفوں

کے ساتھ مل کر مرتب کیں ان کے نام یہ ہیں اُردو کی چھٹی ساتویں اور آٹھویں کتاب، تاریخ ہند، آئینہ عجم اور نکات بیدل سے انتخاب اور تاریخ عالم کہا جاتا ہے کہ جرمن زبان میں کر یہ کتاب علامہ نے جرمنی کے قیام کے دوران ترتیب دی تھی ۔

ناتمام تصنیفات

۱۔ حواشی قرآن

آخر زمانہ میں اقبال کی سب سے بڑی آرزو انگریزی میں حواشی قرآن لکھنے کی تھی اس کا خاکہ بھی انہوں نے تیار کر لیا تھا۔ حوالے کی کتابیں بھی جمع کر لی تھیں۔

۲۔ اصول فقہ اسلامی

اس موضوع پر انگریزی میں کچھ نوٹس بھی لکھ لیے تھے۔

۳۔ تاریخ تصوف

اس کتاب میں یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اس تحریک میں کونسے عناصر غیر اسلامی ہیں، اور کون سے اسلامی اور ان کا ادارہ کا تذکرہ انہوں نے اپنے مضمون اسرار خودی اور تصوف میں کیا ہے۔

۴۔ **اسرار کا تیسرا حصہ** مولانا گرامی کے نام خط میں رموز کے بعد اسی سلسلے میں

تیسرا حصہ لکھنے کا ارادہ کا اظہار کیا ہے۔ عنوان تجویز کیا ہے حیات مستقبلہ اسلامیہ یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامی جس کی تاسیس دعوت اسلامی سے شروع ہوتی ہے کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب کا مقصود و غایت کیا ہے۔ کربلا کے واقعات پر ایک رزمیہ لکھنے کا خیال بھی تھا۔ اس طرح انگریزی میں اسلام اور اجتہاد کے موضوعات پر لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے اُردو میں "زمان کی حقیقت فلسفہ اسلام" میں فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب اور اپنی ذہنی سرگزشت لکھنے کے بارے میں بھی ارادے باندھتے رہتے تھے۔

ادارہ اسلامیات اور دوسرے منصوبے

مسلمانوں کی فلاح اور اسلام کی ترقی و استحکام کے لیے علامہ جن اداروں کو قائم کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا کرتے تھے ان میں سے ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے علامہ نے اسلامیہ کالج کے یوم اقبال کے موقع پر اپنی جیب سے سو روپے کا چندہ بھی تحریک کے طور پر دیا تھا۔ اس اسلامی تحقیقی مرکز کا کام اسلامی تاریخ و ثقافت پر فکر انگیز لٹریچر تیار کرنا اور فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کرنا تھا۔

۲۔ نشر و اشاعت کا ادارہ

اعلیٰ ادب کی اشاعت اور ترویج کے لیے ایک ادارہ طبع و نشر کھولنا چاہتے تھے۔

سید نذیر نیازی سے تفصیلات پر گفتگو بھی کی تھی۔

۴۔ اسلامک ٹرسٹ

۱۹۳۱ء کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ ایک ٹرسٹ کی صورت میں ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کے تمدن، سیاسی حقوق اور دین کی اشاعت کا کام سرانجام دے۔

باب پنجم

فکر اقبال کے جواہر ریزے

عام طور پر اقبال کو ان کے اردو فارسی کلام کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ علمی حلقوں میں ان کے انگریزی کے خطبات اور اردو کے مقالات و خطوط سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے لیکن نسبتاً کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال کی نجی محفلیں بھی علم و عرفان، اور فکر و حکمت کا بہتا دریا ہوتی تھیں۔ کوٹھی کے برآمدہ میں یا کمرے میں چارپائی پر شلوار قمیض پہنے (اور کبھی صرف بنیان تہبند زیب تن کیے) بڑی بے تکلفی سے تکیے کا سہارا لیے لیٹے بیٹھے ہیں۔ آس پاس کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ حقہ سامنے رکھا ہے۔ دو چار کرسیاں سامنے پڑی ہیں۔ باریابی کی عام اجازت ہے چھوٹے بڑے کی قید نہیں۔ جس کا جی چاہے حاضر ہو اور فیضیاب ہو۔ جو آگیا باتیں شروع ہو گئیں۔ اساتذہ، طلبہ، دانشور، وکیل صحافی، اہلِ فکر و فن، امرا، علماء و فقراء، اہلِ سیاست زندگی کے ہر شعبے ہر پیشے ہر معیار اور ہر مزاج کے لوگ حاضر ہوتے اور ہر ذوق و ظرف کے مطابق

سیراب ہوتے۔

اقبال کی اِن مجلسوں اور محفلوں کو ایک ادارے کی سی حیثیت حاصل تھی اقبال کی بصیرت کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ فلسفہ، ادب، تاریخ، سیاست، اخلاق، تصوف، فنون لطیفہ، غرض جو موضوع بھی سامنے آتا وہ اس پر مجتہدانہ انداز میں اظہارِ خیال کرتے لیکن قرآن حکیم کی حکمتوں اور اسلامی فلسفے کی باریکیوں پر ان کی عارفانہ نظر تھی۔ اقبال کی اس کھلی اکادمی سے بے شمار طالبانِ علم و حکمت فیضیاب ہوتے۔ بہتوں کے قلب و نظر روشن ہوئے۔ بدقسمتی سے ان عارفانہ اور حکیمانہ مجلسوں کے مباحث کا بہت ہی قلیل حصہ روزناموں اور یادداشتوں کی شکل میں محفوظ رکھا جا سکا جو ملفوظات اقبال، روایاتِ اقبال، سیرتِ اقبال، ذکرِ اقبال، روزگارِ فقیر، اقبال کے چند جواہر ریزے، انوارِ اقبال، اقبال کامل، مطالعہ اقبال، فیضانِ اقبال، اقبال کے حضور جیسی کتابوں میں شائع ہوا ہے۔ ان کتابوں سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

اِنسان کیا ہے

فرمایا: میرے آباؤ اجداد برہمن تھے انھوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے؟

خدا کے وجود پر دلیل

روایاتِ اقبال میں ہے کہ ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آنے کے بعد اقبال

نے سیالکوٹ کی دو دروازے والی مسجد میں ایک عالمانہ تقریر کی۔ ان کی تقریر کے دوران میں کسی نے سوال کیا کہ خُدا کی ہستی کس طرح ثابت ہوتی ہے۔ اقبال نے اس کے جواب میں پہلے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھا ۔

فلسفی کو بحث کے اندر خُدا ملتا نہیں
ڈور کو سُلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

پھر کہا عالم انسانیت کی وہ عظیم ہستی جس کو نبوت ملنے سے پہلے ہی لوگ صادق اور امین کے لقب سے پکارتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ خُدا موجود ہے اِس لیے میرے نزدیک خُدا کی ہستی پر سب سے بڑی دلیل خود پیغمبر خُدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجُود ہے۔

خدا کی ہستی کا وجود

فرمایا :۔ عقلی دلائل کی مدد سے واجب الوجُود کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ اس کے اثبات کا طریقہ باطنی مشاہدہ یا مذہبی تجربہ ہے۔ خُداشناسی کا ذریعہ فرد نہیں عشق ہے۔ جسے فلسفہ کی اصطلاح میں وجدان کہتے ہیں۔

قرآن کیا ہے

قرآن کریم فلسفہ اور الٰہیات کی کوئی تصنیف نہیں ہے قرآن مجید کو اس زاویہ نگاہ سے مت پڑھو کہ یہ تمہیں فلسفہ کے مسائل سمجھائے گا بلکہ اس زاویہ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا رشتہ کیا ہے۔ اور کائنات میں میرا مقام کیا ہے۔

قرآن مجید اس لیے نازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خُدا سے ربط قلبی کا اعلیٰ شعور

پیدا کر دے تاکہ انسان اس ربط کے بدولت مشیت ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

قرآن مجید

قانون الٰہی کیا ہے؟

" اسلام نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود متعین کرتا ہے ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے"

قرآن اور شرف انسانیت

فرمایا: قرآن سے پہلے کسی ارضی یا سماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا جس کی بشارت قرآن نے دی۔ سخرلکم مافی السموات والارض۔ انسانی خودی کا حقیقی عرفان قرآن سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔

قرآن کافی وشافی

"نفس اسلام قرآن مجید میں بکمال وتمام آچکا ہے خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لیے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"۔

الفاظ اور مفہوم

فرمایا:۔ قرآن کے الفاظ اور مفہوم دونوں الہامی ہیں۔

تلاوت

قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہیے تاکہ قلب میں محمدی نسبت پیدا ہو

قرآن کا نظریۂ انقلاب

فرمایا: "جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آتا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔"

مطالب قرآن

فرمایا:۔ جس قدر انسان کا ذوق وجدان اور اخلاق روحانیت ترقی کرتے جائیں گے اسی قدر اس پر قرآن کے مطالب آشکار ہوتے جائیں گے۔

قرآن کا مقصد

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مسلم بحیثیت فرد وہ انسان بن سکے جسے وحیِ خداوندی احسن التقویم کے نام سے تعبیر کرتی ہے اور ملت اسلامیہ وہ ملت بن جائے جو قرآن پاک کے الفاظ میں دُنیا کی بہترین امت (خیر الامم) ہو

پانچ ارکان

فرمایا:۔ قوم کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلام کے پانچ ارکان یعنی شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا اجراء و انضباط کافی ہے اس کی محسوس اور عملی صورت عہد سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آتی۔

مسلمان ہونے کی شرط

انسان صحیح معنوں میں اسی وقت مسلمان ہو سکتا ہے جب قرآن کے بنائے ہوئے اوامر نواہی بھی اس کی اپنی خواہش بن جائیں۔

تین ستون

فرمایا:۔ مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں ہوتی ہے۔

- ایمان
- فکر
- عرفان حقیقت

دعا

دُعا خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب

گئے یہ انکشاف وتجسس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالب حقیقت کے لیے نفی ذات ہی کالمحہ اثبات ذات کا لمحہ بن جاتا ہے اور جس میں وہ اپنی قدر وقیمت سے آشنا ہوکر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حقیقت کائنات کی زندگی میں سچ مچ ایک فعال عنصر کی ہے۔"

حدود جہاد

فرمایا :۔ جہاد عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بروقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی قوم کی بداخلاقی اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا بزور شمشیر اس قوم سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے۔ طاقت کے بغیر امر ونہی کیسے قائم ہو سکتے ہیں۔

علم کے چار ذریعے

فرمایا :۔ علم کے چار ذریعے ہیں قرآن نے ان چاروں کی طرف واضح رہنمائی فرمائی ہے۔ مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دنیائے جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش رہے گی۔ پہلا ذریعہ وحی ہے۔ اور وہ ختم ہو چکا، دوسرا ذریعہ آثار قدماء تاریخ ہے۔ علم کا تیسرا ذریعہ علم النفس ہے۔ جس کا آغاز وحی انفسکم افلا تبصرون سے ہوتا ہے۔ آخری ذریعہ صحیفہ فطرت ہے جس پر قرآن کی بے شمار آیات دلالت کر رہی ہیں۔

حصول علم جہاد فی سبیل اللہ

ایک آیت ان الذین جاھدوا سبلنا ۔جو لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنی راہیں دکھلائیں گے، کی تشریح کرتے ہوئے آپنے فرمایا :۔
تمام علوم وکمالات اور مقاصد علیہ جو نوع انسانی کے لیے کسی نہ کسی جہت سے مفید ہوں ۔ان کے حصول کی سعی، فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا۔ اس پر علم کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

دین کے اسرار

فرمایا :۔ میری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اسرار منکشف کر جاؤں تاکہ وہ دین کے قریب آجائیں ۔

تعلیم کی حدود

فرمایا :۔ اسوہ رسولؐ شخصیت پرستی کی مخالفت کا بہترین مظہر ہے۔ رسول خدؐا صحابہ کرام کی جماعت کے پاس جب کبھی جاتے تو وہ آپ کو دور سے دیکھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔
آپ نے ایک دو مرتبہ دیکھا اور تیسری مرتبہ منع فرمایا۔
پھر ایک حدیث سنائی یعنی بزرگوں کی محض واجبی تعظیم کرو۔ سجدے کے لائق

صرف خدا کی ذات واحد ہے۔

امر معروف اور نہی عن المنکر

فرمایا: "قرآن میں مسلمانوں کو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیے اس لیے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہو سکتا ہے اگر امر و نہی کے فرائض مسلمان ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں تلوار کا ہونا ضروری ہے"۔

شریعت و طریقت

فرمایا:۔ حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔

امن عالم اور خودی

فرمایا:۔ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہیں نہ ہو امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

حسین و قبیح

فرمایا:۔ جو فعل خودی کو مستحکم کرے وہ حسین ہے جو خودی کو ضعیف بنائے وہ قبیح ہے۔

خودی کا مفہوم

فرمایا:۔ خودی کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔

فلسفہ خودی کا ماخذ

فرمایا:۔ خودی کا فلسفہ صوفیاء کرام اور قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔

سوال

فرمایا:۔ سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔

احترام انسانیت

فرمایا:۔ انسان کی بقاء کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دُنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہیں کرتیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔"

مسلمان

فرمایا:۔ مسلمان ایک ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرتا ہے اسے پاش پاش کرتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

شیرازۂ ملت

فرمایا:۔ ہماری جماعت کا شیرازہ اسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو رہے ۔

اسوۂ حسنہ کا ایک پہلو

علامہ کے سامنے ایک بار کسی نے ذکر چھیڑ دیا کہ مسجد نبوی کے اندر ایک بلی نے بچے دیئے تھے ایک صحابی نے کسی قدر ناراضگی سے انہیں باہر پھینکنے کی کوشش کی تو آنحضرت کی نظر پڑ گئی۔ تو سخت کبیدہ خاطر ہوئے ۔ یہ واقعہ سنتے ہی علامہ پر رقت طاری ہو گئی۔

فرمایا:۔ رسول کریم کے اسوۂ حسنہ میں سب سے زیادہ اہمیت مادرانہ شفقت کو دی گئی ہے کہ یہی بنی نوع کی بقا کا مقدس ذریعہ ہے ۔

نسل و قومیت

فرمایا:۔ اس زمانے میں مسلمانوں اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔

شخصیت اور استحکام

فرمایا:۔ اگر آپ شخصیت کا استحکام چاہتے ہیں تو اس قسم کی سرگرمیاں ترک کر دیجئے جو اس کے لیے مہلک ہیں مثلاً فروتنی، قناعت، غلامانہ اطاعت شعاری اور اسی قسم کے دوسرے انسانی اعمال جنہیں عرف عام میں نیکیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

دوسری جانب اولوالعزمی، تجسس اور روایات پر بجا طور پر فخر کرنا شخصیت کے قلعہ کو مستحکم کرتا ہے۔

مسلمان کی تعریف

فرمایا:۔ انسان صحیح معنوں میں مسلم اسی وقت ہوتا ہے جب قرآن کے فرمائے ہوئے اوامر و نواھی اس کی اپنی خواہش بن جائیں یعنی وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلط کے ماتحت فضائل اخلاق و عبادات پر کاربند اور رذائم و قبائح نفس سے مجتنب ہوں بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمق روح سے اچھلیں اور قرآن صرف شافی دعا نہ رہے بلکہ ایک لذیذ اور زندگی بخش غذا بن جائے منشاء الٰہی اور فطرتِ انسانی میں مغائرت نہ رہے۔

پیروی

فرمایا: کسی شخص کا دوسرے کی رائے پر بلا سوچے سمجھے چلنا میں اسلام اور انسانیت کے منافی سمجھتا ہوں۔

مذہب کا مقصد

فرمایا:۔ مذہب کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے بلکہ اس کی حقیقی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط و متناسب عمرانی نظام نافذ کیا جائے۔

مذہب

فرمایا:۔ مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے۔

انسان کا مرتبہ

فرمایا:۔ کاش اِس راز سے آگاہ ہو جائے کہ اس کو وہ کچھ عطا ہوا ہے جو شمس و قمر کو بھی نہیں ملا یعنی شعور اور شخصیت۔

آزادی کا مقصد

فرمایا:۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظت اسلام اس کا عنصر نہیں تو مسلمان اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

تعلیم

فرمایا:۔ ہماری تعلیم دماغی ترقی کے لیے کوئی ذریعہ مہیا نہیں کرتی اور نہ وسیع النظر بناتی ہے۔ ہر علم کی تعلیم اس قدر ناقص دی جاتی ہے کہ ہم اس علم سے متعارف بھی نہیں ہو سکتے۔ روحانیت کی طرف ترغیب تو کیا ہوتی مذہب اور ہم سے دُور ہوتا جاتا ہے۔"

حکومت کا سب سے بڑا فرض

فرمایا:۔ حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے لیکن اس اہم ترین فرض کو دنیا نے جدید تسلیم ہی نہیں کرتی حکومتیں محض لوگوں کے سیاسی خیالات و رجحانات سے تعلق رکھتی ہیں۔ افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل ہی نہیں سمجھتیں۔

جہاد

سوال:۔ دفاعی ہونا چاہیے یا جارحانہ؟

فرمایا:۔ عام طور پر دفاعی لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہوتا ہے مثلاً اگر کسی قوم کی بداخلاقی اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ لوگوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ بزور شمشیر اس قوم میں سے خرابی ہٹانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سلطان شہید ٹیپو نے مالابار کے غیر مسلم وحشی قبائل سے کہا تھا کہ تم لوگ بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کر دو ورنہ میں بزور شمشیر تمہیں کپڑے پہننے پر مجبور کر دوں گا۔"

سائنس اور فلسفہ

فرمایا:۔ جہاں سائنس ختم ہوتی ہے وہاں سے فلسفہ شروع ہوتا ہے اور حیرت و استعجاب جو سائنس کا انجام ہے فلسفہ کا آغاز ہے۔"

وطن پرستی

فرمایا:۔ اسلام ہر قسم کی بُت پرستی کے خلاف احتجاج کا حکم رکھتا ہے اور وطن پرستی کیا ہے؟
بُت پرستی کی ایک ارفع و لطیف صورت ایک مادّی وجُود کی پرستش۔ مختلف ممالک
کے ترانے سنئے آپ پر خود بخود اس بات کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اسلام بت
پرستی کو خواہ وہ کسی رنگ میں ہو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام جس چیز کے لیے
موت کا پیغام بن کر آیا اس کو قامت اسلام کی قبا نہیں بنایا جا سکتا یہ حقیقت
(کہ جس مقام کو سرکارِ دو عالم کی آما جگاہ اور تربیت گاہ بنایا گیا وہ آپ کی
جائے پیدائش نہ تھی) ایک مخفی اشارہ ہے جس سے وطن پرستی کے تصور کی
تکذیب ہوتی ہے۔

تقلید میں حرکت نہیں

فرمایا:۔ زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہوگا اس میں حرکت مفقود ہوگی۔

پیمانۂ وقت

فرمایا:۔ جد و جہد کرنے والی قومیں وقت کو دن رات مہینے اور سال کے پیمانے سے
نہیں بلکہ سعی اور حصول کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔"

تباہی

فرمایا:۔ قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

نیکی بدی کا معیار

فرمایا: نیکی وہ ہے جو ہماری خودی کے ترفع میں معاون ہو اور بدی وہ ہے جو اس خودی کو کمل کر بالآخر فنا کر دے۔

اسلامی تصوف کیا ہے؟

فرمایا: خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن انا الحق کے معنی یہ نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ انا ہی اصل چیز ہے بندہ اگر خدا میں گم ہو جائے تو اس نے اپنی ہستی مٹا دی۔

فقر کیا ہے

فرمایا: فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں بلکہ استغناء دولت سے بے نیازی ہے۔ دولت جوہر مردانگی کی موت ہے۔ اس سے جرأت جاتی رہتی ہے۔

مختار و مجبور

فرمایا: اسلام مختار بھی ہے مجبور بھی۔ انسان کی عظمت کی نشانی یہ ہے کہ آدمی اپنی مجبوریوں پر غالب آتا رہے۔

نظریہ وطنیت

فرمایا:۔ اسلام جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہے اس میں رنگ اور نسل اور قومیت کی تمیز نہیں اسلام میں دین اور سیاست کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔"

انسان کی مستقل حیثیت

فرمایا:۔ ہر ایک انسان اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور کسی کا وجود بیکار نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت کا پتہ اس وقت چلتا ہے۔ جب ہمیں کسی شخص سے اچھی طرح سابقہ پڑے اور ہم اُسے قریب سے دیکھیں ہیں۔

حاکمیت اور تعمیر کردار

فرمایا:۔ خدا نے حاکمیت میں تعمیر کردار، تربیت سیرت کے جو مواقع رکھے ہیں وہ محکومیت میں نہیں ہیں۔"

مسلمان کی بہترین تلوار

فرمایا:۔ مسلمان کی بہترین تلوار دُعا ہے اس سے کام لینا چاہیے۔ ہر وقت دُعا کرنی چاہیے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہیے۔

شخصیت یا خودی کا کمال

فرمایا:۔ شخصیت یا خودی کا کمال یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کا خیال کر کے تمام

تعلقات سے آزاد ہو جائے ۔ یعنی تعلقات سے بالا ہو جاتے ۔ قرب خونی اور بعد خونی کی بنا ۔ پر فرق کرنا بے انصافی ہے ۔ زندگی کی حقیقت قرب و بعد سے معرّیٰ ہے ۔ کامل انسان تمام عالم کے لیے رحمت ہوتا ہے ۔ کامل انسان تعلقات سے بالاتر ہوتا ہے ۔

توکل کامل

فرمایا :۔ میرے تمام معاملات جان و مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہے ۔ جب سے میں نے ایسا کیا ہے ۔ مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا ۔ اس کی مرضی میری مرضی ہے ۔

انصاف نہیں رحم

فرمایا :۔ ہمیں اللہ سے اس کے فضل و رحم کی دعا مانگنی چاہیے ۔ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔

فوق البشر

فرمایا :۔ اسلام ہی وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں ۔

ہیرو کی تعریف

فرمایا :۔ " وہ انسان جس کے اعمال و افعال نوع انسانی کے لیے چشمہ ہائے زندگی جاری کرنے والے ہوں " شخصیت پرستی اور ہیرو ورشپ ہندو قوم کی امتیازی صفت

ہے مگر اسلام اس کے خلاف ہے۔

دین اور ملت کی بنیادیں

فرمایا:۔ اسلام بحیثیتِ دین خُدا کی طرف سے ظاہر ہُوا لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔"

تین پہلو

فرمایا:۔ اسلام انسانی شخصیت کے تین پہلوؤں کی یکساں تربیت اور آبیاری کرتا ہے۔

۱۔ شعور

۲۔ جذبہ

۳۔ ارادہ

اسلام میں کوئی ذات نہیں

طلبہ سے فرمایا:۔ میں آپ کو صرف ایک نصیحت کرتا ہوں اور آپ میری رائے کو شہرت دیجئے۔ ہر ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ذات کی لعنت کو یکسر ترک کر دے۔ آپ کی ذات صرف اسلام ہے۔"

گناہ

فرمایا:۔ ہر انسان چھوٹے پیمانے پر خود ایک خالق ہے اور ان تحقیقی قوتوں کو

ضائع کرنے کا نام گناہ ہے۔

مسلمان عورت

فرمایا:۔ مسلمان عورت کو بدستور اسی حد کے اندر رہنا چاہیئے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ اور جو حد کہ اس کے لیے مقرر کی گئی۔ اسی کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔

پردہ

فرمایا:۔ عورت کا جنسی تقدس اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اجنبی نگاہوں سے بہر نوع محفوظ رکھا جاتے۔ عورت ایک بہت ہی عظیم ذریعہ تخلیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دُنیا کی تخلیقی قوتیں مستور و محجوب ہیں۔"

آزادی نسواں

فرمایا:۔ آزادی نسواں کا موجودہ سیلاب معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوسناک کوشش ہے جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر ضرور پشیمان ہوئی۔

فقر

فرمایا:" فقر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے نورِ ایمان بھی کسبِ حلال سے پیدا ہوتا ہے۔"

استغناء

فرمایا:۔ فقر سے مراد افلاس نہیں استغنا ہے۔ دولت جوہرِ مردانگی کی موت ہے اس سے جرأت اور مردانگی جاتی رہتی ہے۔"

فولاد

فرمایا:۔ مسولینی کا اصول یہ تھا کہ "جو فولاد رکھتا ہے وہی روٹی کھاتا ہے"۔ میں اس میں ذرا ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "جو فولاد ہے سب کچھ اسی کے پاس ہے"۔

تقدیرِ اُمم

فرمایا:۔ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دار و مدار اس پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں؟

خُودی کا پس منظر

۱۹۳۲ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے موقع پر انڈیا سوسائٹی کے زیرِ اہتمام استقبالیہ میں تقریر کرتے ہُوئے اقبال نے فلسفہ خودی کے پس منظر پر یوں اظہار خیال کیا:۔

جب سے دیارِ مغرب میں اقتصادی انقلاب آیا کارخانہ داری کے نظام نے فرد بشر

کو انفرادی حیثیت سے بہت حقیر اور بے مایہ بنا دیا ہے اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ گویا ایک پر کاہ ہے جس کو سوسائٹی کا بے پناہ سیلاب بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

ان حالات پر غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دور میں انسان کو ایک ایسے جام کی ضرورت ہے جو اس کی افسردگی اور اس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دے۔ جس سے اس کے قدم یقین اور خود اعتمادی کی چٹان کی طرح محکم ہو جائیں اور اس راز سے آگاہ ہو جائے کہ اس کو وہ کچھ عطا ہوا ہے جو شمس قمر کو بھی نہیں ملا۔ یعنی شعور (Consciousness) اور شخصیت (Personality)

اگرچہ وہ کائنات کے مقابلے میں ایک ذرہ ہے مگر اس ذرے کے اندر ایک علیحدہ دُنیا موجُود ہے۔ ذی روح اور ذی شعور ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس دُنیا کو اپنے فکر اور عمل سے آباد کرے۔"

حسن

فرمایا: حسن قوت سے خالی ہو تو محض ایک پیغام موت ہے۔

طبیعت و زبان

فرمایا: ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔

قوم کی جنس

فرمایا: جس طرح دنیا کی دُوسری اشیا میں نر اور مادہ کا جنسی امتیاز موجُود ہے اسی طرح قومیں

بھی نر اور مادہ ہوتی ہیں اور اس کا پتہ ان کے قول و عمل معاشرت و کردار اور فضائل و

نفسیات سے چلتا ہے۔

عقل عشق

سوال کیا گیا:۔ عقل کی انتہا کیا ہے؟

فرمایا:۔ سیرت

پوچھا گیا:۔ عشق کی انتہا کیا ہے؟

فرمایا:۔ عشق کی کوئی انتہا نہیں عشق لا انتہا ہے۔

شاہین

فرمایا:۔ شاہین محض شاعرانہ بات نہیں اس میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اوروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

(۲) بے تعلق ہے کہ آشیاں نہیں بناتا۔

(۳) بلند پرواز ہے۔

(۴) خلوت پسند ہے۔

(۵) تیز نگاہ ہے۔

ماحول اور انقلاب

فرمایا:۔ زندگی اپنے ماحول میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے

اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجُود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجُود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

تمدن اور تہذیب

استفسار تھا۔ تمدن، سویلائیزیشن اور کلچر کے الفاظ آجکل اس طرح استعمال ہو رہے ہیں گویا ہم معنی ہیں آپ ان میں کس طرح امتیاز کریں گے۔

ارشاد ہُوا۔ سویلائیزیشن یا تمدن کا تعلق باہر کی دُنیا سے ہے اور کلچر کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔

کامیاب زندگی کا تصور

اقبال کی نگاہ میں کامیاب زندگی کا اصل اصول جد و جہد، تگ و تاز اور مسلسل کوشش و کاوش ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبین

سکون کی تلاش، ٹھہراؤ یا کونے میں چھپ کے بیٹھنا کامیاب زندگی کے تصور کے منافی ہے، آگے بڑھنے، ٹکرانے، گرنے اور گر کر پھر اٹھنے اور آگے بڑھنے کا نام زندگی ہے۔

اقبال نے اپنی فارسی کتاب جاوید نامہ میں لکھا ہے:

(ترجمہ) اگر تمہارے اندر سورج کی کوئی چمک دمک ہے تو آسمانوں کی پہنائیوں میں اپنی شعاعیں پھینکو، اگر وہ سینہ ہے جو تیر کا وار سہہ سکے تو دنیا میں شاہین کی طرح زندہ رہو اور شاہین کی طرح مرو۔ شیر کی زندگی کا ایک لمحہ بزدلوں کی ساری زندگی پر بھاری ہوتا ہے۔

حرکت اور عمل کے بارے میں بھی اقبال کا ایک مخصوص نقطہ نظر ہے۔ اقبال کا خیال ہے جد و جہد اور تگ و تاز کی زندگی بے معنی ہو جائے گی۔ اگر یہ گھسی پٹی فرسودہ راہوں میں گردش کرتی رہے۔ کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں حرکت کرتے رہنے یا ایک لکیر کو پیٹتے رہنے کا نام حرکت اور عمل نہیں۔ اقبال کے یہاں حرکت و عمل اور جد و جہد کا تصور تخلیقی ہے۔ عمل طبع زاد ہو، تخلیقی ہو، کوئی نئی بات پیدا کی جائے۔

کوئی نئی دریافت ہو۔ دنیا میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے۔ تہذیب نے جو معرکے سر کیے ہیں وہ انسان کی قوت ایجاد اور جدت فکر و نظر کے کرشمے ہیں۔ زندگی کی تب و تاب کے لیے ضروری ہے کہ انسان مشکل تر کو تلاش کرے اور آسان تر کو رد کر دے۔ چونکہ مشکل کے بطن سے ہی نئی چیز پیدا ہوگی نئی راہ نکلے گی اسی اصول کے تحت، اقبال کا کامیاب انسان سماجی اور مادی ماحول سے نبرد آزما رہتا ہے اور اپنے نصب العین کے مطابق اس کی نئی تشکیل و ترتیب میں مصروف رہتا ہے۔ سماجی دائرے میں اس رویئے کا نتیجہ ایک بہتر اور برتر معاشرہ کی شکل میں نکلے گا اور مادی دنیا کو تسخیر کرنے کی کاوش کا نتیجہ سائنس ٹیکنالوجی کی فتوحات کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس معیاری انسان کے کردار کی بہترین تفسیر اقبال کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" میں ملتی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ انفرادیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے اور کونسی صفات سے انفرادیت کی نشو و نما ہوتی ہے ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:۔

اُٹھ اور ایک نئی دنیا پیدا کر
اپنے آپ کو شعلوں میں لپیٹ لے، ابراہیم بن جا
عاجزی سے، نامساعد حالات سے سمجھوتہ کرنا۔
میدانِ جنگ میں سپر ڈالنے کے مترادف ہے۔

وہ یقیناً مضبوط کردار کا انسان ہے جس کے ہاتھ میں اس کے اپنے نفس کی لگام ہے۔

اس کے مزاج سے زمانہ خود سازگار ہو جاتا ہے۔
اور اگر زمانہ اس سے سازگار نہیں ہوتا
تو وہ زمانے سے، آسمان سے نبرد آزما ہو جاتا ہے

وہ اپنے زور بازو سے ایک نئی دنیا نیا ماحول پیدا کرتا ہے جو اس سے ساز گار ہو سکے
اگر انسان مردانہ وار زندہ نہیں رہ سکتا
تو پھر بہادروں کی طرح جان دیدینا ہی زندگی ہے۔

زندگانی قوت کا نام ہے۔
اور اس کا سرچشمہ سربلندی و ظفرمندی کا ذوق ہے۔
زندگی کھیتی ہے اور فصل قوت ہے۔
حق و باطل کے راز کی شرح قوت ہے۔

اے انسان، تو آداب امانت سے بے خبر ہے۔
اپنے آپ کو دونوں جہانوں سے بہتر شمار کر

یہ انسان کا بلند ترین تصور ہے انسان اپنے عمل سے اپنے جوش کردار سے خود آگہی و خوداعتمادی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت خود اعتمادی ہے۔ اپنی منزل پر اعتماد اور اپنی صلاحیت کار پر اعتماد" اسرار خودی" کے ایک شعر کا ترجمہ ہے۔

زندگی دوسروں کے گرد گھومنے سے نجات پانے اور خود اپنے آپ کو مرکز و مقصود بنانے کا نام ہے۔

دوسروں پر تکیہ کرنا انفرادیت کی نفی ہے اور اپنی شخصیت کے تخلیقی اور ارتقائی امکانات سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ اگر انفرادیت کے ارتقاء کے مسئلہ کو اجتماعی زندگی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو قومی زندگی کی بقا بھی اسی میں ہے کہ قوم اپنے وسائل اور اپنے ذرائع پر بھروسہ کر کے انہیں بروئے کار لاتے اور خود کسی قوم

کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ بلکہ غیر ملکوں کی طرف سے امداد کے نام پر جو پیش کیا جائے تو اُسے قبول کرنا قومی غیرت کے منافی سمجھے۔ یہ پیغام اقبال نے اس وقت دیا تھا جب ۱۵-۱۹۱۴ء کے لگ بھگ نوآبادیاتی نظام کی گرفت تیسری دُنیا کے ملکوں پر سخت ترین تھی۔

انفرادیت کے ارتقاء اور خود شناسی کے بعد اقبال کے معیاری انسان کی دوسری خصوصیت اس کی ذہنی جودت اور روشن دماغی ہے۔ انفرادیت کی تربیت میں ذہنی قوت کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ذہانت تسخیرِ آفاق میں فطرت کی قوتوں کو فتح کرنے اور انسان کے علم اور قوت میں اضافے کے لیے صرف ہونی چاہیے۔ عقل اور ذہانت کے پُورے ارتقاء کے بغیر انسان اپنے ماحول اور مادّی عناصر کے رحم و کرم پر رہے گا اور اس کا عمل، اس کی جدو جہد کا دائرہ بہت محدود غیر مؤثر رہے گا۔

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی ۔۔۔ باہر نہیں کچھ عقل خدا داد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلال ازلی کا ۔۔۔ اک دل ہے کہ ہر لحظہ اُلجھتا ہے خرد سے

ضربِ کلیم کے ان دو شعروں سے عقل اور سائنس کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اقبال، علم و فن، سائنس کی قوت اور ضرورت کا قائل ضرور ہے اور ایک مثالی انسان کے تصور میں عقل یا حکمت ایک عنصرِ ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اقبال دوسرے فلسفیوں، مفکروں کی طرح محض علم و سائنس کو یا دماغ کی روشنی کو کافی نہیں سمجھتا۔ علوم و فنون، سائنس و ٹیکنالوجی۔ ذہن اور دماغ تلوار کی طرح مستحسن مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور مذموم مقاصد کے لیے بھی علم و سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے انتہا ترقی کرنے کے باوجود زمانہ حاضر کا انسان اپنے

سماجی مسائل کو سُلجھانے سے عاجز رہا ہے

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جسنے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس قطعے کے آخری مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم و فن عقل و دانش مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اس قوت کو بھی لگام دینے کی ضرورت ہے۔ عقل کو تعمیری طور پر استعمال کرنے کے لیے اخلاقی اور روحانی قدروں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کا معیاری انسان اپنی عقل و دانش رضائے الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کا جینا مرنا، اس کی صلح، اس کی جنگ، خُدا کے لیے ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" کے دو شعروں کا ترجمہ ہے:

صلح شر ہو جاتی ہے اگر اس کا مقصود غیر اللہ ہو، اگر جنگ خُدا کے لیے ہو تو خیر ہے ورنہ نہیں۔ جو کوئی خنجر غیر اللہ کے لیے اُٹھاتا ہے تو اس کا خنجر خود اس کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ کے لیے لڑنا صرف عام معنوں میں لڑنا ہی نہیں۔ (جو صرف بعض انتہائی صورتوں میں جارحیت اور ظلم کے خلاف جائز ہے۔) جہاد ہر ممکن طریقے سے جد و جہد کا نام ہے تاکہ ذاتی اور اجتماعی زندگی میں توازن اور عدل قائم ہو سکے۔ عموماً یہ جہاد اپنے نفس کی پستیوں کے خلاف ہوتا ہے۔ مردِ مسلمان کی پہلی جنگ تو اپنے آپ سے ہوتی ہے۔ ایک اور شعر کا ترجمہ ہے۔

ترجمہ:۔ مردِ مومن اپنے آپ سے برسرِ پیکار رہتا ہے، اپنے نفس کی ایسی گرفت کرتا ہے۔ جیسے چیتا کسی ہرن پر جھپٹ کر گرتا ہے۔

اس خود آگہی سے، جہدِ مسلسل سے، عقل و فہم کی ترقی سے، علم و دانش کو رضائے الٰہی

کے تابع کر کے انسان اپنی شخصیت کے اندرونی امکانات کو بروئے کار لاتا ہے اور اپنی انا کو مضبوط بناتا ہے۔ اپنی ذات کے ان اندرونی وسائل کو ترقی دے کر وہ اپنی شخصیت کو اتنا بلند کر سکتا ہے کہ وہ خود تقدیر الٰہی بن جائے۔

انسانی انا کی بلندیوں تک سفر اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو اپنی امکانی عظمتوں کا احساس ہو۔ جب وہ اپنے ماحول کے شر کے ساتھ مفاہمت نہ کرے جب وہ جہل و ظلم کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

انفرادیت اور شخصیت کے مکمل ارتقاء کے بعد، سونے یا مشینوں کے بتوں پر نہیں اپنی انا اور خدا پر ایمان لانے کے بعد انسان ترک سبب کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

اقبال کا قول ہے۔

ترجمہ : ۔ بندۂ حق اسباب کا غلام نہیں رہتا۔

اور اس کی انا کی قوتیں اس کو سراپا خیر بنا دیتی ہیں۔

اقبال کا قول ہے:۔

یہ بندۂ حق اپنے رزق روزی کے لیے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرتا جان دے دیتا ہے لیکن عزت نفس کا سودا نہیں کرتا۔ وہ فرد یکتا ہوتا ہے جو خود شناسی کی منزل تک پہنچ گیا ہو، اور وہ غیور قوم ہے جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔

اس طرح کا کردار پیدا کرنے کے لیے جس میں قدروں کا شعور بھی ہو ایثار و احسان کرنے کا احساس ہو، اور پھر ان کو بروئے کار لانے کے لیے ارادے کی قوت بھی حاصل ہو ان کو تین صفات یا خوبیاں بڑے اہتمام سے پیدا کرنی چاہیں۔

جرأت و حوصلہ

برداشت، صبر و ضبط اور

فقر

کامیاب زندگی میں ان تین صفات کی اہمیت:

اقبال کا خیال ہے کردار کی تعمیر و تربیت کے لیے جرأت کا رویہ ضروری ہے تعلیم کو اس طرح منظم کیا جائے کہ تعلیمی سلسلے سے وہ تمام اثرات خارج ہو جائیں۔ جو زندگی میں خوف کا رویہ بیدار کرتے ہیں۔ فکر اقبال کے مطابق خوف بد ترین جذبہ ہے۔ جس طرح ایمان یا عشق سے ذات مستحکم ہوتی ہے۔ خوف سے انسان کے کردار میں ہر طرح کے ذمائم کی بنیاد پڑتی ہے خوف ایمان کی نفی ہے وہ انا کو ضعیف کرتا ہے، خدا کے خوف کے سوا، ہر خوف جوش حیات کو، ذوق زندگی کو سرد کرتا ہے۔ اس سے عمل کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے اور خوف حد سے بڑھ جانے پر عمل کی صلاحیت بالکل سلب ہو جاتی ہے۔ خوف اور بہت سی اخلاقی بیماریوں، دھوکا، فریب، جھوٹ، بزدلی، خوشامد کمینہ پن کی جڑ ہے۔ رموز بے خودی میں ہے۔

ترجمہ:۔ ہر شر جو تمہارے دل میں چھپا ہوا ہے اس کی جڑ میں اگر تم غور سے دیکھو تو خوف بیٹھا ہوا ہوگا۔ جدید ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ بعض اوقات وہ مظاہر قوت کا اظہار نظر آتے ہیں۔ جیسے رعب ڈالنا، ظلم، قوت کا بے جا مظاہرہ، ان کی تہہ میں بھی خوف کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

خوف موجودہ مغربی تہذیب کا امتیازی نشان معلوم ہوتا ہے۔ یہ تہذیب واضح طور پر خوف اور حسد کی گرفت میں ہے لیکن توحید کو فکر و عمل کا مرکز بنا کر جرأت کی صفت کی نشو و نما کی جا سکتی ہے۔ توحید کو فکر و عمل کا مرکز بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا

ہر خوف کو مسترد کر دیا جائے اور ہر اس طاقت و قوت کا مقابلہ کیا جائے جو آزادیٔ فکر یا خودی کی تعمیر میں رکاوٹ بننے یا بن سکتی ہو۔ اقبال کہتے ہیں :

ترجمہ ۔ خُدا کا خوف تو ایمان کی علامت ہے۔ غیر اللہ کا خوف چھپا ہوا شرک ہے اغیار کے خوف سے آزاد ہو تو قوت خوابیدہ ہے، بیدار ہو جا۔

رموزِ بے خودی میں اقبال نے تفصیل سے بحث کی ہے کہ کس طرح خوف، مایوسی اور بزدلی جیسی بے شمار برائیوں کی جڑ ہے۔ یہاں تک کہ خود جوشِ حیات اس سے سرد پڑ جاتا ہے اور کس طرح توحید کے عقیدہ کو عمل میں لا کر ان برائیوں کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کے بعض اشعار کا ترجمہ ہے ۔

اے وہ جو مایوسی کے غم خانے میں اسیر ہے نبی صلعم نے مایوس نہ ہونے کی تعلیم دی ہے اسے سیکھو اگر تم خُدا پر ایمان رکھتے ہو تو اپنے آپ کو ہر خوف سے نجات دے دو اور سود و زیاں کے ہر خیال سے آزاد ہو جاؤ ۔

اللہ کے خوف کے سوا ہر خوف قاطع عمل ہے ۔

خوف زندگی کے قافلے کے لیے رہزن ہے ۔

جس نے بھی رسول اللہ کی تعلیمات کو سمجھا ہے اس کو خوف میں شرک مضمر نظر آتا ہے ۔

زندگی کے ایک رہنما اصُول کی حیثیت سے توحید کا نتیجہ مساوات اور ربطِ ملت ہی نہیں خوف سے آزادی بھی ہے جب توحید کردار کا رہنما اصُول بن جائے تو انسانوں کا کردار اور ان کی زندگی سرا سر بدل جاتی ہے اور ان کے اندر ایک نئی حرارت اور عزت نفس پیدا ہو جاتی ہے۔ کردار سازی کے عمل میں توحید پہ ایمان کی حیثیت مسلم ہے ۔

یہ ایک قومی المیہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی اور تعلیم میں خوف کی عمل داری ہے۔

تعلیمی اداروں میں بھی سوچنے کا خوف، تخلیق کا خوف طرح نو ڈالنے کا خوف پایا جاتا ہے۔ نتیجتاً ایسی نسلیں پرورش پارہی ہیں۔ جن کے اندر جرأتِ فکر، جرأتِ اظہار اور جرأت تخلیق کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔

خوف کا استیصال توحید پر جوش ایمان سے ہوسکتا ہے۔ پر جوش ایمان، خوف کو زائل کرتا ہے اور بے پناہ جرأت پیدا کرتا ہے۔ خطرے کی زندگی بسر کرنا ہی زندگی ہے۔ خطرہ پسندی کا رویہ اس رویے سے متضاد ہے۔ جو تعلیم کو سستے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جو اونچی تنخواہ پر ایک آرام دہ نوکری کو ساری تعلیم کی معراج سمجھتا ہے۔

اقبال کے نقطہ نظر سے انفرادیت کی تربیت کی ایک شرط رواداری بھی ہے ورنہ افراد کی انفرادیت ایک دوسرے سے مسلسل ٹکراتی رہے گی اور نتیجۃً کسی کی انفرادیت کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس لیے ایک دوسرے کی انفرادیت کا احترام ضروری ہے۔

انفرادیت کے احترام کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے مختلف عقائد، آراء، فکر، کردار ، اختلافات کا احترام کیا جائے۔ دوسروں کے اپنے سے مختلف ہونے کا حق قبول کیا جائے۔ اسی طرح ہر فرد کی اپنی شخصیت، اپنے انفرادی امتیازی خدوخال برقرار رکھ سکتی ہے۔ رواداری کا رویہ آفاقی انداز رکھتا ہے اس سے انسان کی وفاداریاں تنگ حد بندیوں سے بلند ہو جاتی ہیں۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی   گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق   نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

لیکن یہ رواداری ذہنی لاتعلقی، بے حسی یا عقیدے کی کمزوری کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اقبال

کی روا داری اپنے عقیدے پر پختہ یقین سے پیدا ہوتی ہے۔

روا داری کا یہ رویہ بھی توحید ہی پر ایمان و ایقان سے پھوٹتا ہے۔ چونکہ اصل سب کی ایک ہے، سب کا خالق، رازق، رب ایک ہے اس لیے خدا کے سارے بندے ایک رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ جاوید نامہ میں ہے:

ترجمہ: دین کیا ہے، کمال کے حصول کے لیے مسلسل کاوش۔

اس کا انتہا عشق (الٰہی) ہے اور ابتدا (بندوں کا) ادب

منہ سے سخت لفظ نکالنا گناہ ہے۔

کافر ہو کہ مومن سب کا خالق خدا ہی ہے

آدمیت کیا ہے؟ آدمی کا احترام

آدمی کے مقام کی قدر کرنا سیکھو

بندہ عشق، خدا کی سنت کو اختیار کرتا ہے

کافر ہو کہ مومن دونوں پر شفقت کرتا ہے

کردار کی تیسری صفت فقر و استغنا ہے۔ جسے اقبال کامیاب زندگی کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ فقر، یا استغنا مجبوری، محرومی، یا رہبانیت کا نتیجہ نہیں۔ اقبال کی نظر میں انفس و آفاق کو تسخیر کرنے، مادی دنیا کے وسائل کو زیر کرنے سائنس اور ٹیکنالوجی میں کمال حاصل کرنے، دولت و صنعت میں کمال حاصل کرنے کے بعد، مادی مال و دولت اور مادی سود و زیاں، سے بلند ہونا بھی لازمی ہے ورنہ ہوسِ مال و جاہ انفرادیت اور روحانی ارتقاء کو ختم کر دیتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد مغربی قوموں نے مال، دولت دنیا کی غلامی اور مادی لذتوں کی اسیری کا جو رویہ اختیار کیا اس کا نتیجہ اخلاقی، ...نی

زوال کی صورت میں ظاہر ہوا فقر مادی فتوحات کو اعتدال میں رکھتا ہے۔ فکر کی بے نیازی اور دل کا غنی ہونا مفلس کے لیے نہیں منعم کے لیے ہے فقر سے انا ترقی کرتی ہے اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے بے نیازی آزاد کرتی ہے اور احتیاج غلام۔ وہ شخص جو اپنے وسائل سے بلند اور بے نیاز نہیں ہوتا آخر کار ان کا محتاج ہو جاتا ہے اور احتیاج سے خودی ضعیف ہوتی ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو فقر بھی توحید ہی کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے۔ انسان کو ہر قسم کی مادی اور روحانی کمزوریوں سے نجات دیتا ہے۔ بال جبریل میں ہے۔

خدا کے پاک بندوں کو غلامی میں کوئی زرہ محفوظ رکھتی ہے تو استغنا۔

مال و دولتِ دنیا سے بے نیازی، بالکل نیا خیال نہیں ہے۔ ہندو اور بدھ متوں میں مایا کے جال سے خبردار رہنے کو کہا گیا ہے لیکن اقبال کا فقر ترک دنیا یا رہبانیت یا دولت و حکومت سے گریز نہیں سکھاتا یہ تسخیرِ دُنیا، دولت کے امارت کے حکومت کے حصول کے بعد اس سے بے نیاز ہونے کی منزل ہے یہ استغنا، یہ بے نیازی، یہ فقر انسان کو روحانی، جذباتی سکون اور مادی طاقت عطا کرتا ہے۔

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری و ناری

اقبال کے تصور کا یہ فقر مشرقی تصوف کے فقر سے بھی بہت مختلف ہے۔

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا — تمہارا فقر ہے بے دولتی و مہجوری
نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے — وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری

اقبال کے فقر کا مزاج اور ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری   اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر سے شبیری اس فقر میں ہے میری   میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

یہ فقر دولت و قوت سے مربوط قباحتوں سے انسان کو نجات دیتا ہے فقر سے انسان ذہنی اور جذباتی اعتبار سے مستحکم ہو جاتا ہے۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ علم و خرد   فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

یہ فقر یہ دولت و قوت کی لذتوں سے بے نیازی کوئی خیالی آدرش نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے دُنیا میں جب بھی کوئی بڑا کام ہوا ہے جب بھی کوئی بڑی مہم سرانجام پائی ہے اس کو بروئے کار لانے والے وہی عظیم انسان تھے جو ایک عظیم مقصد آدرش کے لیے زندہ رہے۔ جو مایا کے جال میں نہیں پھنسے، جو مادی لذتوں اور خود غرضی کی زندگی سے بلند تھے قیادت اور انسانیت کا جوہر ہی اپنے وجود کے حیوانی اور جبلی تقاضوں سے اوپر اٹھنے میں ہے۔ فقر کی ایک روایت مشرقی ملکوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ لیکن نوآبادیاتی دور کے سیکولر نظام تعلیم نے تعلیم میں خود غرضی، تنگ دلی سکھائی، نوکری اور اس سے متعلق رعایتیں اور فوائد کے حصول ہی مقصود ہو گیا۔

اقبال کا معیاری انسان، اپنی خدا داد صلاحیتوں کو حدِ امکان تک نشو و نما دیتا ہے۔ خبر میں اور نظر میں یکتا ہونے کے بعد، تسخیر انفس کے بعد، اپنی صلاحیتوں، اپنی انا اپنی انفرادیت کو پروان چڑھانے کے بعد، وہ تسخیر آفاق کی مہم پر نکلتا ہے۔ اور آفاق کو زیر کرنے کے بعد یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی اور علوم و فنون میں کمال حاصل کرنے کے بعد مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد دولت و حکومت پر غالب ہونے کے بعد وہ فقر و استغنا کا رویہ اختیار کرتا ہے تاکہ وہ مایا کے جال میں نہ پھنس

جائے۔ اور مادی لذتوں کا غلام بن کر اپنی روحانی قوتوں کو اور انا کو کمزور نہ کر دے۔

اس بہتر اور برتر انسان کی تصویر، جس کی خودی پورے طور بیدار ہے بالِ جبریل کی مشہور نظم مسجد قرطبہ میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کردار کی یہ بلندی، یہ آئیڈیل کردار قابلِ حصول بھی ہے؟ یہ بندۂ مولا صفات، جس کا دل بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی ہو، جس کی اُمیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں جس کی ادا دلفریب اور نگہ دل نواز ہو، جو نرم گفتگو اور گرم دمِ جستجو ہو اور جس کی پاک دلی و پاکبازی رزم اور بزم دونوں میں برقرار رہے؟ ایسا آئیڈیل انسان کسی تعلیم و تربیت سے کسی ذریعے سے ممکن ہے بھی؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ انسان کی صلاحیتوں کے ۔ انسان کی انا کے ارتقاء کے امکانات کے بارے میں ہمارے تصورات کیا ہیں؟ اور پورے انسانی ارتقاء کے سلسلے کو ہم کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی بھی آئیڈیل صرف منزل کا، صرف سمت کا تعین کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کردار اور انفرادیت کے ارتقاء کا وہ آئیڈیل جو اقبال نے پیش کیا ہے بحیثیت آئیڈیل کے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ زندگی کا وہ آئیڈیل جو تگ و تاز، جد و جہد، خود آگاہ اور خدا مست ہونے کی تعلیم دیتا ہے جو خود غرضی اور نفس پرستی کی نفی کرتا ہے جو بڑے اور عظیم مقاصد کے لیے مرنا

اور جینا سکھاتا ہے ۔ وہ آئیڈیل کیسا آئیڈیل ہے ۔

تاریخ گواہ ہے کہ بلند مقاصد نے، عظیم و جلیل تصورات نے انسانوں اور قوموں کی تقدیر بدل دی ہے ۔ اور بظاہر ناممکن آئیڈیل حقیقی کارناموں کی شکل میں بدل گئے ہیں ۔ خیال میں، آئیڈیل میں، بڑی قوت ہوتی ہے پروانوں کے دلوں میں چراغوں ہی کی نہیں ستاروں کی آرزو بھی مچلتی رہتی ہے ۔ اقبال کا مثالی کردار ایک مثالی معاشرہ میں پرورش بھی پاتا ہے اور اس معاشرہ کو مستحکم بھی کرتا ہے پھر ایسا معاشرہ جو ان قدروں کی بنیاد پر منظم کیا گیا ہو اس سانچے میں ایسے آئیڈیل کردار کی تربیت بہت زیادہ ناممکن نہ ہونا چاہیے ۔ اگر ایک پوری تہذیب و تمدن کا مزاج ہی ایک خاص انداز کا کردار پیدا کرنے کا ہو تو ایسے خود آگاہ، خدامست انسان کا پیدا ہونا ناممکن نہیں قرار دیا جا سکتا اگر ایک ذہین مگر لادینی تہذیب ذہین مگر خود غرض اور نفس پرست افراد پیدا کر سکتی ہے تو ایک خود آگاہ، خدامست تہذیب، خود آگاہ و خدامست، افراد کیوں نہیں پیدا کر سکتی اقبال نے جن منزلوں کی نشاندہی کی ہے وہ عظمت انسانی کی نقیب ہیں ۔

اقبال کے تعلیمی تصورات

اقبال کے یہاں مروجہ نظام تعلیم پر سخت تنقید ملتی ہے۔

مئے یقیں سے ضمیر حیات ہے پرسوز
نصیب مدرسہ یارب یہ آب آتشناک
خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

مقصد ہے اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کرسکتے تھے جو زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ
شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

یہ فیضانِ نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی   سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی؟

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا   کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

یہ اشعار "ضربِ کلیم" اور "بالِ جبریل" کے ہیں۔ "بانگِ درا" کی ابتدائی نظموں میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ "تعلیم اور اس کے نتائج" میں ہے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم   کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

"فردوس میں ایک مکالمہ" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے اشعار ہیں۔

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی   فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو   پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اور "مذہب" نامی نظم کا شعر ہے:

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی   اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مروجہ نظامِ تعلیم پر اس تنقید کے بنیادی نکتے یہ ہیں:

- یہ لادینی ہے، روحانی قدروں سے عاری۔
- پست نظر ہے کہ فکرِ معاش سے آگے نہیں سوچتا۔
- کم نظر ہے کہ اس سے نظر میں گہرائی نہیں آتی۔
- اس کی بنا محسوس پر ہے اور یہ لامحسوس حقیقتوں کا منکر ہے۔

ہر نظامِ تعلیم اپنے پیچھے ایک فکری نظام، ایک فلسفۂ زندگی رکھتا ہے۔ مغربی نظامِ تعلیم لادینی (سیکولر) ہے وہ نیوٹن کے سائنسی فلسفے پر مبنی ہے۔ اس نظام کے

مطابق کائنات میکانکی ہے۔ زندگی مادی چیز ہے۔ حقیقت تک رسائی صرف عقل کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور آخر کار زندگی علم و عقل کے ذریعہ سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتی ہے۔ اور انسان کے سماجی، اقتصادی، اخلاقی مسائل بالآخر علم و عقل ہی کے حوالے سے سُلجھائے جا سکتے ہیں۔ اس نظامِ فکر میں وجدان کی، خدا کی، مذہب کی، کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے اس فلسفے کے مفروضات پر مبنی مغرب کا جو لادینی سیکولر تعلیمی نظام مرتب کیا گیا اس میں بھی سارا زور علم و عقل پر، تجربے، سائنسی طریق پر تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب میں اس مادی فلسفے نے صنعتی انقلاب بھی پیدا کیا اور اس کے علمی تجرباتی ذوق نے جدید سائنسی اور ٹیکنالوجی کی راہیں بھی ہموار کیں۔ لیکن اس فلسفے پر مبنی جو سیکولر تعلیمی نظام سامراجی تسلط کے زمانے میں باقاعدہ طور پر میکالے نے برصغیر پاک و ہند میں رائج کیا۔ اس میں اصل کی خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ یہ وہ علمی و سائنسی تجرباتی ذوق بھی پیدا نہ کر سکا۔ جس سے مغرب نے مادی طور پر فائدہ اُٹھایا۔

"بالِ جبریل" کے اس شعر

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

میں ادائے کافرانہ اور تراشِ آزرانہ کا مطلب یہی ہے کہ اس تعلیم میں کوئی قدر بھی نہیں ہے نہ خبر، نہ نظر۔ جبکہ اقبال جس نظامِ فکر کا علمبردار ہے اس کے مطابق تو تعلیم کے مقاصد میں یہ تینوں چیزیں شامل ہیں۔ خبر، نظر اور اذانِ سحر بھی۔

کیا تُو نے صحرا نشینوں کو یکتا خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں

خبر علم و عقل ہے، نظر حقیقت کا وجدانی شعور، اور اذانِ سحر، اخلاقی عمل چنانچہ سیکولر، نوآبادیاتی نظامِ تعلیم پر اقبال کی تنقید بالکل منطقی ہے۔ وہ ایک ایسے

نظامِ تعلیم کو اس کی بدترین شکل میں کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ جس کے بنیادی تصورات ان کے بنیادی تصورات سے متصادم و متضاد ہوں۔ مثلاً اقبال کا تصورِ کائنات میکانی اور مجبور نہیں۔ نامیاتی، حرکی اور تخلیقی ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید	کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اور زندگی بھی اقبال کے خیال میں حرکی اور تخلیقی ہے اور لاانتہا تخلیقی امکانات اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔

زندگی کے اس تخلیقی اور ارتقائی تصور کو "بالِ جبریل" کی مشہور نظم "ساقی نامہ" میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

یہ عالم، یہ ہنگامۂ رنگ و صوت	یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم، یہ بت خانۂ چشم و گوش	جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولین	مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر	طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر!
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود	کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا	تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار	کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

زندگی کے اس تصور کی روشنی میں تعلیم کا مقصد انسان کی خودی یا انفرادیت کی تربیت و ترقی ہے تاکہ وہ اپنے تخلیقی عمل سے اپنی ذات کے لامحدود امکانات کو بروئے کار لاسکے۔

اگر خودی یا انفرادیت کی نشوونما تعلیم کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ تو اس خودی یا انفرادیت کی تربیت کیسے کی جائے؟ اس کی نشوونما کا طریقہ کیا ہے؟ وہ کونسے بیرونی اور اندرونی حالات ہیں جو انفرادیت کی نشوونما کے لیے سازگار فضا

پیدا کرتے ہیں یہ ہے وہ سوال جس کا جواب تعلیم کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔

خودی کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ یہ کوئی جامد اور ساکت چیز نہیں۔ خودی تجربے سے، عمل سے۔ جدوجہد سے بڑھتی ہے۔ اس کو ٹکرانا پڑتا ہے بیرونی قوتوں سے اور اپنے اندر کی تخریبی قوتوں سے بھی۔ تجربے اور تحریک سے خالی پرسکون تنہائی کی زندگی ارتقائے خودی کے منافی ہے۔

شخصیت یا انفرادیت کی نشو ونما ایک تخلیقی عمل ہے جس میں انسان عملی حصہ لیتا ہے یہاں مجہولیت سے کام نہیں چلتا۔

خودی کے فروغ کے لیے اپنے آپ پر اعتماد کرنا۔ اپنے وسائل سے استفادہ کرنا بھی ضروری ہے۔ سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔ دوسری قوموں اور تہذیبوں پر انحصار کرنا ان سے خیالات اور تہذیبی قدریں مانگنا قومی خودی کو مجروح کرنا ہے! اندھی تقلید سے انفرادی خودی کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور قومی خودی کو بھی۔ اقبال نے اس نقصان کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے جو غلامی کے زمانے میں برصغیر پاک و ہند کو مغربی تہذیب سے پہنچا چونکہ مغرب سے یہ تعلق غلامی کے زمانے میں ہوا اس لیے احساس کمتری کی وجہ سے یہ تعلق بہت سطحی رہا۔ مغربی تہذیب کی اصل تک ہندوستانیوں کی نظر نہ پہنچ سکی۔ وہ مغربی تہذیب کے اوپری چھلکے کی آب و تاب سے دھوکا کھا گئے۔ بقول اقبال مغرب کی قوت و راز چنگ و رباب میں، بے حجاب عورتوں کے رقص میں، یا لاطینی رسم الخط میں یا لادینی خیالات میں نہیں، بلکہ اس کے علم و فن، تسخیر عالم آفاق کے کمال میں اور تجرباتی نقطہ نظر میں ہے۔

شخصیت کا راستہ سخت کوشی کا راستہ ہے۔ لیکن مغرب زدگی کی بدقسمتی

یہ ہے کہ وہ مغرب سے بھی سطحی چیزیں مستعار لیتی ہے۔ مغربیت کی روح تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ اقبال مغرب کے ذوق تحقیق و تجربہ اور عالم آفاق کی تسخیر کے لیے سخت کوشی کی زندگی کے مداح ہیں لیکن اس کے سطحی پہلوؤں کو مسترد کرتے ہیں۔ خصوصاً وہ باتیں جو ہماری اخلاقی قدروں سے متصادم ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ نوجوانوں میں وہ حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہو کہ اپنی راہ خود پیدا کریں۔ ہمارا نظام ابھی تک مانگے ہوتے خیالات، اداروں اور اجنبی زبان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ تعلیمی تصورات، نصاب، تعلیم طریقے، قومی عزت نفس کے منافی رہے ہیں۔

تحقیقی جد و جہد، اور خود اعتمادی کے بعد انفرادیت کی نشو و نما کے لیے تیسری شرط آزادی فکر و عمل ہے۔

خودی کی تربیت آزاد فضا میں ہی ہو سکتی ہے طلبہ کو تجربے اور مشاہدے کے لیے مناسب آزادی ہو۔ قیادت کے مواقع ہوں، مواد اور طریقوں کے انتخاب میں اور رد میں اختیار ہو۔ اور طلبہ براہِ راست، ذاتی تجربے سے سیکھیں۔ اقبال کے تصور کے مطابق تعلیماتی نظام میں ارتکاز نہ ہو۔ اساتذہ اور اداروں کو اپنا نصاب، اور طریقِ تعلیم انتخاب کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ اسکول ایک وسیع تجربہ گاہ ہو۔ نئے نئے تجربے کرنے کا، غلطیاں کرنے کا اور ان سے سیکھنے کا حوصلہ ہو وہ شیشہ گھر کے پودوں کی طرح نہ ہو کہ کھلی ہوا اور دھوپ برداشت نہ کر سکیں۔

بندگی میں گھٹ کر رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

انفرادیت کی نشو و نما کے لیے زنجیروں کو توڑنا پڑتا ہے اپنی ذات سے باہر۔

کی زنجیروں کو بھی اور اندرونی زنجیروں کو بھی۔ آزادی کی روح انتخاب کر سکنے کا اختیار ہے۔ بغیر اختیار کے تخلیق اور نادرہ کاری ممکن نہیں۔

موجودہ زمانے میں تجرباتی طور پر حاصل کیے گئے علم کی اہمیت پر اقبال نے بہت زور دیا ہے اپنے انگریزی خطبات میں لکھتے ہیں۔

"تجربے کی راہ میں جو غلطیاں ہوں گی وہ بھی قابل قبول ہوں گی۔ تجربہ کر کے، غلطیاں کر کے ہی علم کی سرحدیں آگے بڑھیں گی" اسی لیے اقبال ذہنی بزدلی کو بھی نشانہ تنقید بناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "نئی راہیں نکالو۔ نئے افق تلاش کرو۔"

نئی بات پیدا کرنا (نادرہ کاری) چونکہ انفرادیت کا اظہار ہے اس لیے اقبال کی نگاہ میں اس کی اتنی فوقیت ہے کہ اگر کار نادر گناہ بھی ہو تو وہ اسے ثواب سمجھتے ہیں۔ انفرادیت کے نشو و نما کا مقصد بھی یہی ہے کہ طلبا میں ندرتِ فکر و عمل پیدا ہو جائے۔ انفرادیت کے نشو و نما سے تہذیبی اور تمدنی ارتقا کے لامحدود امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ندرت فکر و عمل سے ملت کا ثبات ہے ؎

ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

ندرت فکر و عمل کے اس تصور سے طریق تعلیم کا جو اصول بنتا ہے وہ کم و بیش وہی ہے جو ڈیوی کے مشہور اصول تعلیم "سیکھنا، عمل سے" یا پروجیکٹ طریقہ کا اصول ہے۔ یعنی طالب علم براہ راست اپنے ذاتی تجربے سے سیکھے۔ مسئلہ اس کے سامنے ہو اور وہ اپنے ذہن پر زور ڈال کر اس کا حل تلاش کرے۔ علم کے سوتوں تک خود جائے اور علم کی طلب میں واقعی ذوق و شوق سے کام لے۔ ذہنی تعلیم کے اس نظریئے میں شب!

بغیر سمجھے پڑھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اس طریق تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلباء میں تنقید کا رجحان پرکھنے کا رویہ پیدا ہو۔ یہ وہ رجحان ہے جس نے جدید تجرباتی ذہن کو جنم دیا۔ اسی سائنسی رویے نے ٹیکنالوجی کی فتوحات کو ممکن بنایا۔

"پیام مشرق" میں ہے کہ علم کے ہما کو گرفت میں لانا ہے تو یقین کم کرو، شک سے بھی کام لو۔ یہ خبر علم کی منزل ہے یہاں چھان پھٹک کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے۔

لیکن علم کا سارا فروغ، خبر کی ساری دولت، عقل کی ساری روشنی مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس لیے اقبال محض کتابی علم کا، صرف معلومات کا خزانہ جمع کرنے کے قائل نہیں۔

اصل حقیقت تو زندگی ہے، یا مقصد تخلیقی عمل ہے۔ اس لیے علم اور ندرت فکر و نظر کو بھی با مقصد تخلیقی عمل پیدا کرنے کے کام آنا چاہیے۔ "ضرب کلیم" کا قطعہ ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو ۔۔۔ کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

خبر کے ساتھ نظر کی اہمیت پر اصرار فکر اقبال کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جدید تعلیم کی ضرورت سے زیادہ ذہن پرستی کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے، سترھویں صدی کے اواخر میں نیوٹن کے نظریات نے زندگی کے میکانکی تصورات کو پختہ اور مستحکم کیا۔ اس نقطہ نظر میں عقل کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ زندگی کا اصل مسئلہ علم، سائنس اور عقل و ذہانت کا ارتقاء ہے اور زندگی کے سماجی، اقتصادی، اخلاقی مسائل کا حل بھی عقل محض کے ارتقاء میں فرض کیا گیا۔ "ضرب کلیم" کی نظم "زمانہ حاضر کا انسان" میں اقبال نے مغربی تہذیب کی اس ٹریجڈی کو بے نقاب کیا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا!
جس نے سورج کی شعاعوں کو اسیر کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

مغرب میں تعلیم سیکولر (غیر مذہبی) ہے۔ سیاست سیکولر ہے۔ مذہب علیحدہ ہے۔ معیشت علیحدہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیوٹن کی مادیت کی وجہ سے وہ روح اور مادہ کی دوئی (ثنویت) کے قائل ہیں۔ روح کی دُنیا اور ہے اور جسم یا مادہ کی دنیا اور۔ اقبال اس ثنویت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس لیے سیاست، تعلیم، معیشت سب میں وہ اخلاق اور مذہب کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ فکر اقبال میں توحید کا عقیدہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی جڑ سے مختلف سمتوں میں ان کی فکر کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ جو شخص بھی کائنات زندگی، اور خدا کے بارے میں اقبال کے نظریات اور عقائد سے متفق نہیں۔ اس کے لیے اقبال کی تعلیمی تصورات بھی بے معنی ہوں گے۔

اقبال نے ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی طوفان سے آشنا ہونے، اور صاحب کتاب ہونے کی ضرورت کی توجیہات کی ہے وہ گویا اخلاقی تعلیم کی ضرورت کا اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں فکر اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ ذہنی تعلیم کی طرح انہوں نے اخلاقی تعلیم کے لیے بھی آزادی اور اختیار ضروری قرار دیا ہے۔ اخلاقی تعلیم کا روایتی تصور یہ تھا کہ چند اخلاقی ضابطوں اور اصولوں کو اوپر سے تھوپ دیا جاتے اور ان سے مجہول مطابقت کو ہی کافی سمجھا جائے۔ گویا روایتی اخلاقی عمل میں ترک و اختیار کی آزادی اور ذاتی تدبر و تجربے کی آزادی کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس سلسلے میں اقبال نے ایک نئی بات کہی ہے۔

"نیکی کوئی مجبوری کی بات نہیں ہے۔ یہ بہ رضا و رغبت اخلاقی آئیڈیل کو قبول کرنے کا نام ہے۔ مجبوری سے کی ہوئی کوئی نیکی، نیکی نہیں کہلائی جاسکتی۔ ترک و اختیار کی آزادی نیکی کی شرط ہے۔ جہاں اچھا کام کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہ ہو اُسے اچھا کام نہیں کہا جا سکتا" اس اقتباس سے اخلاقی تعلیم کے دو اہم اصول متعین ہوتے ہیں۔ صرف بندھے ٹکے اخلاقی ضابطوں اور اصولوں کی تعلیم دے دینے سے جن پر بے سوچے سمجھے میکانکی انداز سے عمل کرنے کی توقع کی جاتے۔ صحیح معنوں میں اخلاقی رویّہ اور کردار پیدا کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اخلاق جبر کا نہیں اختیار کا معاملہ ہے۔ اخلاقی رویّے اسی ماحول میں ذاتی تجربے سے پیدا ہوتے اور مستحکم ہوتے ہیں، جہاں کچھ ترک یا اختیار کرنے کی آزادی ہو۔ اخلاق ایک عملی چیز ہے۔ روزانہ کی زندگی میں دوسروں سے لین دین اور تعلق سے یہ اخلاقی رویّہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاقی اصولوں کا خالی علم ہی اخلاقی کردار کا محرک نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ محض یہ جاننا کہ اچھا کیا ہے بُرا کیا ہے۔ اچھے عمل کی ضمانت نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اخلاق ایک جذباتی رویّہ ہے اور ایک سماجی چیز ہے۔ آدمی تنہائی کے جزیرے میں محصور ہو کر نہ اخلاق سیکھ سکتا ہے۔ اور نہ کوئی اسے اخلاق سکھا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے یہ اصول نکلتا ہے کہ اخلاقی تعلیم کے لیے تعلیمی اداروں کو سماجی زندگی، اور سماجی تجربے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ منظم سماجی تجربے سے ہی اخلاقی قدروں کی حس بیدار ہو سکتی ہے۔

اس لیے اخلاقی تعلیم رسمی نہیں سماجی زندگی کے تجربے میں رچی بسی ہونی چاہیے۔ انفرادیت کے ارتقاء کے لیے ایک اور عنصر ہر دم، ہر لمحہ نئے مقاصد، نئی منزلوں، نئی آرزوؤں کی دریافت اور آرزو ہے۔ جو انسان کے عمل اور ترقی کی سمت متعین کرتے ہیں۔

زندگی نام ہی بہتر سے بہتر کی آرزو کا ہے

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

انفرادیت کا حصول سخت کوشی اور خطر پسندی کی زندگی میں ہے

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

"پیام مشرق" "اسرار خودی" "ضرب کلیم" میں بار بار یہی سخت کوشی اور خطر پسندی کی تعلیم ملتی ہے۔ جو انفرادیت کو مستحکم کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔

انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت تخلیق کام کی ہے۔ ذہن کا ارتقا بھی، عمل ہی کے کام آنے کے لیے ہوا۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے عمل کو کیسے معرض ضبط میں لایا جائے۔ فکر جدید کا رجحان طبعی اور حیاتیاتی علوم کی کامیابی سے متاثر ہو کر (جو اصل میں ذہن کی مادہ پر کامیابی ہے) یہ ہے کہ ذہن ہی زندگی کی ارتقائی جد و جہد میں کامیاب رہنمائی کر سکتا ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ حقیقت تک رسائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک تجرباتی عقل کا جس کا ادراک جزوی ہوتا ہے دوسرا وجدان، عشق یا نظر کا۔ دل کے ذریعے حقیقت کا ادراک بھرپور ہوتا ہے۔ خطبات میں اقبال نے لکھا ہے۔

"دل عقل ہی کی انتہائی لطیف اور اعلیٰ شکل ہے"۔

لیکن اقبال نے عقل محض پر بھی سخت تنقید کی ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغ راہگزر ہے

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

لیکن یہ صرف احتجاج عہد جدید کی عقل پرستی کے خلاف ہے۔ ورنہ تجرباتی علم اور

ذہن کی دراکی کی اقبال بہت قدر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں : علم کے ذریعہ تسخیر فطرت (عالم آفاق) حقیقت میں عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ فطرت کا مشاہدہ کرنے والا سائنس دان بھی ایک طرح کا صوفی ہے۔ جو محوِ عبادت ہے۔

اقبال کی عقل محض پر تنقید عقل پرستی کے تباہ کن تہذیبی و تمدنی اثرات کی وجہ سے ہے۔ اقبال کا مقصد علم کی طاقت اور وجدان کی نظر میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔

اقبال چاہتے تھے کہ دُنیا کو باور کرایا جائے کہ علم یا سائنس کی پیدا کی ہوئی لاانتہا طاقت انسان کو تباہ کر دے گی۔ اگر عقل کو عشق کے، نظر کے، قلب کے، روحانی قدروں کے تابع نہ کیا گیا۔ گوئٹے کی طرح اقبال بھی ابلیس کو عقل محض کی علامت سمجھتے ہیں جو بذاتِ خود بہت قیمتی ہے لیکن روحانی اور اخلاقی رہنمائی کے بغیر انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

خواجہ غلام السیدین کو اقبال نے ایک خط میں لکھا ہے :-

علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے "علم" کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ "جاوید نامہ" کے ایک شعر کا ترجمہ ہے:

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق پر "جاوید نامہ" میں کئی اشعار ہیں۔

مسلمان کے لیے لازم ہے علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت حاصل ہوتی ہے) حاصل کرے۔ اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا

اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جاتے تو نوع انسان کے لیے سراسر رحمت ہے۔"

اسی خیال کو اقبال نے ضرب کلیم کی نظم بعنوان "جاوید" سے' میں یوں ادا کیا ہے۔

جوہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف — تعلیم ہو گو فرنگیانہ

شاخ گل پر چہک ولیکن — کر اپنی خودی میں آشیانہ

اسی مجموعے کے آخر کے یہ شعر بھی محل غور ہیں۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن — قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں!

کھلے ہیں سب کے لیے غربیوں کے میخانے — علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — ترے بدن میں اگر سوز لاالٰہ نہیں

اقبال نے موجودہ نظام تعلیم پر جو سخت تنقید کی ہے۔ وہ اس کے سکولر پہلو پر ہے علمی عقلی و تجرباتی پہلو پہ نہیں۔ سائنسی غور و فکر مشاہدہ و تجربہ تو فکر اقبال کے نزدیک ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ چونکہ تجربے کی بنیاد پر ہی انا کا تخلیقی ارتقاء ممکن ہوتا ہے۔

جدید تعلیم صرف تسخیر عالم آفاق کو کافی سمجھتی ہے اور اس کی تمام تگ و تاز کا مقصود و مطلوب بھی یہی منزل ہے۔ جبکہ اقبال تسخیر عالم آفاق کے ساتھ تسخیر عالم انفس کو بھی برابر کی اہمیت دیتے ہیں، چونکہ تسخیر آفاق و انفس کے لیے "خودی" انا یا انفرادیت کا انتہائے کمال تک ارتقاء ضروری ہے اس لیے انفرادیت کے ارتقاء کا تصور اقبال کے تعلیمی تصورات میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

حیاتِ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ

راجہ طارق محمود

هدیه، دوسو روپے

بُک کارنر پرنٹرز پبلشرز
مین بازار جہلم پاکستان
فون: ۶۲۴۳۰۶

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

اے ایمان والو!

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم پر درود اور خوب سلام بھیجو

عکسی

فضائلِ درود شریف

مؤلفہ

راس المحدثین حضرت الحاج الحافظ مولانا محمد زکریّا صاحب مدظلہٗ

شیخ الحدیث مظاہرِ علوم سہارنپور

جس میں

درود شریف کے فضائل اور نہ پڑھنے پر وعیدیں اور خاص خاص درودوں کے فضائل اور آداب و مسائل، اور روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا طریقہ اور درود شریف کے متعلق پچاس قصّے ذکر کئے گئے ہیں

ناشر

بک کارنر پرنٹرز پبلشرز مین بازار جہلم